S. No. 9

ISSN : 2394-5567

سہ ماہی ادبی جریدہ

دبیر

جلد:- سوم

شمارہ:- چہارم

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء

مدیر: احمد نوید یاسر 'ازلان حیدر'

از: دبیر حسن میموریل لائبریری، کاکوری، لکھنؤ

DABEER

Oct. to Dec. 2016

No. 9

ISSN : 2394-5567

S. No. 9

DABEER

S.No. : 3

Volume : 4

(An International Peer Reviewed Quarterly Literary Refereed Journal)

October to December 2016

Editor:-

Ahmad Naved Yasir 'Azlan Hyder'

Address:-

DABEER HASAN MEMORIAL LIBERARY

12, Choudhri Mohalla, Kakori, Lucknow-226101

Mob. No. 09410478973, email: dabeerpersian@rediffmail.com

ISSN:- 2394-5567

صوفیاء کی زمین کاکوری سے فارسی ادب کا ترجمان.....

سہ ماہی ادبی جریدہ۔

دبیر

جلد۔۳ شمارہ۔۴

اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔ چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ مقالہ نگاروں سے گزارش:۔ حواشی مقالہ کے آخر میں لکھیں، مآخذ کے حوالہ جات اس ترتیب میں ہوں:۔ مصنف یا مولف، کتاب کا نام جلد، مقام اشاعت، سن اشاعت، صفحہ نمبر۔

اپنے مقالے اردو ان پیج، یا ایم ایس ورڈ کی فائل میں ہمارے برقی پتے پر ارسال کریں۔

☆سرپرست☆ **پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی**، صدر شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

☆نگران اعلی☆، **پروفیسر سید محمد اصغر عابدی**، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

☆نگران☆، **ڈاکٹر انجمن صدیقی** (لکھنؤ)

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، شعبۂ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، شعبۂ فارسی، اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر علیم اشرف خان، شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل، شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

محمد قمر عالم، شعبۂ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

ذوالنورین حیدر علوی، مدیر شش ماہی ''تصفیہ'' کاکوری، لکھنؤ

سید نقی عباس کیفی، مدیر سہ ماہی ''نقد و تحقیق'' دہلی

ارمان احمد، مدیر سہ ماہی ''عرفان'' چھپرا، بہار

☆معاون مدیران☆

محمد توصیف خان کاکر۔ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

عاطفہ جمال، فارسی، لکھنؤ

مناظر حق بدایونی، فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد حسن، تعلیم، اے ایم یو، علی گڑھ

محمد انس، تاریخ، اے ایم یو، علی گڑھ

سارم عباس، فلسفہ، اے ایم یو، علی گڑھ

اشرف علی، ہندی، اے ایم یو، علی گڑھ

ڈاکٹر راجیش سرکار، سنسکرت، بی ایچ یو، وارانسی

محمد جعفر، فارسی، جے این یو، دہلی

سعد الدین، فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی،
ڈائرکٹر، مرکز تحقیقات فارسی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی،
سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس دہلی یونیورسٹی، دہلی

پروفیسر محمد اقبال شاہد، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز اسلامک واورینٹل لرننگ، جی سی یو، لاہور، پاکستان

پروفیسر ابوموسیٰ محمد عارف باللہ،
ڈائریکٹر البیرونی فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

پروفیسر عبدالقادر جعفری، صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی

☆مجلس مشاورت☆

پروفیسر مسعود انور علوی، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
پروفیسر عراق رضا زیدی، صدر شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، شعبۂ فارسی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال
پروفیسر محمد مظہر آصف، شعبۂ فارسی، گوہاٹی یونیورسٹی، آسام
پروفیسر عزیز بانو، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد
پروفیسر وجیہ الدین، شعبہ عربی و فارسی، بڑودا یونیورسٹی، بڑودا، گجرات
احمد علی، کیپر (مینسکرٹ)، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ
ڈاکٹر عطا خورشید، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ
ڈاکٹر مظہر عالم صدیقی، یوسف اسلام کالج، جوگیشوری، ممبئی
ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی قادری رامپوری، مسٹن گنج، رامپور
ڈاکٹر عابد حسین، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
ڈاکٹر اخلاق احمد، شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی
ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان، مانو، حیدرآباد
ڈاکٹر رضوان اللہ آروی، شعبۂ فارسی، ایچ ڈی جین کالج، آرہ، بھوج پور
ڈاکٹر نکہت فاطمہ، شعبہ فارسی، مانو لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ
ڈاکٹر شبیب انور علوی، شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
سید عادل احمد، محکمہ آثار قدیمہ، حیدرآباد، تلنگانہ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱۔	اداریہ	ازلان حیدر	۴
☆	**مقالات**		
۲۔	عزم سیر نجف وطوف حرم ہے مجھ کو	عارف نوشاہی	۵
۳۔	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات	زہرہ خاتون	۲۵
۴۔	خزائن الفتوح کی تاریخی اور ادبی اہمیت	انصار الحق	۳۱
۵۔	فن ترجمہ ادبیات فارسی کے تناظر میں	سیدہ عصمت جہاں	۳۴
۶۔	قدیم ہندوستان میں فن صحافت	نیلوفر حفیظ	۴۱
☆	**میراث خطی**		
۷۔	مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں ابن سینا کے مخطوطات	عطا خورشید	۴۹
☆	**دکنیات**		
۸۔	بہمنی دور میں فارسی زبان وادب	نکہت فاطمہ	۵۵
	آئینۂ تحقیق		
۹۔	پایان نامہائے شعبہ فارسی، دانشگاہ ہندوی، بنارس	محمد کاشف رضا	۶۸
☆	**چشم بینش**		
۱۰۔	غالب کے کلام میں سائنسی کہکشاں (مرتبہ: محمد آزاد حسین)	محمد ارشاد احمد	۷۰

English Aritcles:

1. Journey of Iranian films after the Islamic revolution
Sarfaraz Ahmad Khan 3

2. Qutbshahi Period: An era of Indo-Iranian literary cutural activities
Qaiser Ahmad 12

3 The role of Afghan nobles during the Delhi Sultanate
Saba Sammreen Ansari 18

اداریہ

ندیم یاران مصطفیٰ، بشارت محبوب کبریا، ناظرین عجائبات بحر و بر، علمائے علمِ خشک و تر، واقف ظلمات و انوار، عوارف عالم اسرار، خالق کی انمول تخلیق، بزرگان دین وملت، عرف عام میں صوفیائے کرام کے حالات وواقعات، ملفوظات ومکتوبات، ارشادات وتعلیمات اور سیرت وکردار اس بات کے شاہد ہیں کہ انہوں نے خلق خدا کی فیض رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، بندگان خدا کے عیوب کی پردہ پوشی، ان کی بے بسی اور مجبوری پر اظہار ہمدردی کے ساتھ ساتھ ان کی مدد کی سعی بلیغ، زندگی کے سخت مراحل اور مشکل گھڑیوں میں ان کی رفاقت، امراض ظاہری و باطنی میں مسیحائی ان نفوس قدسیہ کی کتاب زندگی کے روشن ابواب ہیں۔ ان کے دروازے خستہ حال، درماندہ اور نکبت وافلاس کے ماروں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے کیونکہ ان کا اس بات پر یقین راسخ تھا کہ اگر چہ جنت کا حصول عبادت وریاضت سے ہوسکتا ہے لیکن وصال حق خدمت خلق کے بغیر ممکن نہیں یہی وجہ رہی کہ پسماندہ، مفلوک الحال، لاچار، بے سہارا اور مظلوم عوام جوق در جوق مشائخ کرام کی درگاہوں، خانقاہوں، سجادوں، تکیوں، دائروں اور اور زاویوں کی طرف رخ کرتے جہاں زخم خوردہ انسانیت پر مرہم تسکین رکھا جاتا۔ غم زدوں کی غمخواری کی جاتی، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کی جاتی۔ ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ سے بے نیاز صوفیائے کرام کے یہ شاندار کارنامے جن میں نام ونمود، ریاکاری اور ظاہرداری کا شائبہ تک نہیں تھا انسان اور انسانیت کی خدمت کے سلسلے میں جو نقش ثبت کیا ہے تاریخ اس کی مثال دینے سے قاصر ہے، اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مختلف سلاسل کے صوفیائے کرام نے اپنی منظوم ومنثور تصانیف میں انسان کو موضوع بنایا اور اس کے مقام ومرتبہ پر گفتگو کی اور عہد حاضر کے چند افراد نے ان ہی نفوس قدسیہ کو حاشیہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ خدا ان کی تعلیمات سے زمانہ کو فیض یاب فرمائے (آمین)

(ازلان حیدر)

عارف نوشاہی (پروفیسر)
اسلام آباد، پاکستان
arifnaushahi@gmail.com

عزم سیر نجف وطوفِ حرم ہے ہم کو

(سفر نامۂ نجف وکربلا، ۲-۱۸ اکتوبر ۲۰۱۵)

تقریب سفر:۔ یہ اگست ۲۰۱۵ء کی کوئی بھلی گھڑی تھی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کے مدیر-عیسی کریمی-کا فون آیا کہ عتبہ عباسیہ، کربلا کا کتب خانہ اور شعبۂ مخطوطات، قلمی میراث کی حفاظت اور احیاء کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس منعقد کر رہا ہے، انھوں نے پاکستان سے دو نام مانگے ہیں۔ کریمی صاحب نے میرا نام خود ہی لیا اور دوسرا نام مجھ سے پوچھا۔ میں نے کسی جھجک کے بغیر ڈاکٹر احمد خان کا نام لیا جو پاکستان میں عربی مخطوطات کے ماہر ہیں۔ کریمی صاحب نے ہم دونوں کے نام عتبہ عباسیہ کو بھیج دیے۔ کچھ دنوں بعد وہاں سے باقاعدہ دعوت نامہ، ٹکٹ اور ایک خط آ گیا۔ خط ویزا کے بارے میں تھا، جس میں عراقی وزارت داخلہ نے اپنی وزارت خارجہ سے کہا تھا کہ مختلف ملکوں میں عراقی سفارت خانوں کو ہدایت کریں کہ متعلقہ افراد (جو کانفرنس میں مدعو تھے اور ان کی فہرست لف تھی) کو ویزا جاری کر دے۔ میں اور ڈاکٹر خان ایک دن وہ خط لے کر صبح صبح عراقی سفارت خانے پہنچ گئے لیکن متعلقہ ویزا افیسر نے کہا کہ انہیں وزارت خارجہ سے ایسی کوئی ہدایت نہیں ملی لہذا ویزا ندارد۔ ہم اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے۔ جب ویزا ہی نہیں تو سفر کیسا؟ ہم نے اس صورت حال سے کانفرنس کے منتظمین کو آگاہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمیں سفارت خانے سے ویزا لینے کی ضرورت نہیں ہے، ہم نجف ہوائی اڈے پر اتریں گے، وہیں ویزا مل جائے گا۔ مجھے اس یقین دہانی پر شرح صدر نہ تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اسلام اباد ہوائی اڈے پر پاکستانی امیگریشن والے پاسپورٹ پر ویزا نہ ہونے کی بنا پر ہمیں روک لیں گے اور خواہ مخواہ بدمزگی اور پریشانی ہوگی۔ میں نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا، لیکن ڈاکٹر خان ڈٹے رہے اور کہنے لگے وہ تو جائیں گے! اچانک مجھے سوجھا کیوں نہ پرواز سے قبل اسلام آباد ہوائی اڈے کی امیگریشن انتظامیہ سے معلومات لے لی جائیں کہ وہ ہمارے ساتھ کیا ''سلوک'' کریں گے؟ اتمام حجت کے لیے میں پرواز سے ایک دن پہلے ہوائی اڈے چلا گیا اور ایک متعلقہ افیسر-فہیم صاحب-کو وہ کاغذ دکھایا جو عراقی وزارت داخلہ کی طرف سے ہمیں ملا تھا۔ افیسر نے کہا کہ ہماری طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی آپ جا سکیں گے۔ ایسے کاغذات پر مسافروں کو جانے دینا ہمارا روز کا معمول ہے۔ فہیم

صاحب نے کہا کہ اتفاق سے کل ان ہی کی امیگریشن پر ڈیوٹی ہوگی، لیکن انھوں نے تاکید کی کہ ہمیں اپنی پرواز OK to board کروانا ہوگی۔ ان کی اس آخری بات پر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی کہ اس سے کیا مراد ہے اور اطمینان سے گھر چلا گیا۔ ڈاکٹر خان کو خوش خبری دی اور اگلا دن سفر کی تیاری میں گذر گیا۔

نجف روانگی:۔ ہمارا ٹکٹ قطر ائرویز سے تھا، جس کے مطابق ہم نے ۱۲ اکتوبر کی صبح ۳ بج کر ۵۰ منٹ پر اسلام آباد سے روانہ ہونا تھا اور دوحہ پہنچنا تھا، اور دوحہ سے ۷.۳۰ بجے روانہ ہوکر ۹.۲۵ بجے نجف اترنا تھا۔ سعود نوشاہی مجھے ائرپورٹ چھوڑ آئے، ڈاکٹر خان وہاں میرے منتظر تھے۔ قطر ائرویز کے کاونٹر پر گئے، تو وہاں موجود سٹاف نے محض ٹکٹ دیکھ کر بورڈنگ کارڈ مشین سے نکال لیا، لیکن ہمیں تھمانے سے پہلے کہا کہ ذرا اپنے پاسپورٹ تو دکھایئے۔ پاسپورٹ پر جب کوئی ویزا نظر نہ آیا تو ہم سے ویزا مانگا، ہم نے کاغذ آگے کر دیا۔ اسے کچھ تردّد ہوا تو اس نے ڈیوٹی پر موجود فلائٹ مینجر سے پوچھا کہ ان دو مسافروں کو بورڈنگ کارڈ جاری کیا جائے یا نہیں؟ فلائٹ مینجر نے کہا کہ ہمارے ٹکٹ OK to Board نہیں ہیں، جب تک ایسا نہ ہوگا ہم لوگ جہاز پر سوار نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے خود ہی کہا کہ وہ اپنے مرکزی دفتر کو پیغام بھیجتے ہیں، اگر مثبت جواب آیا تو ٹھیک ورنہ معذرت۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے بتایا کہ جواب نفی میں آیا ہے لہذا ہم جہاز پر سوار نہیں ہو سکتے۔ اب کیا کرتے؟ ہم بیٹھے رہے، یہاں تک کہ تمام مسافر اندر چلے گئے اور بھیڑ چھٹ گئی۔ ہم فلائٹ مینجر کے پاس گئے اور اس سے بات کی۔ اس نے کہا چونکہ کمپیوٹر سسٹم میں ہمارا سٹیٹس OK to Board نہیں ہے، وہ ہمیں یہاں سے سوار کر بھی دیں، ہوسکتا ہے دوحہ میں نجف کے جہاز پر ہمیں سوار نہ ہونے دیا جائے۔ اس صورت میں ہمیں ڈی پورٹ ہونا پڑے گا اور قطر فضائی کمپنی پر بھاری جرمانہ عاید کیا جائے گا۔ ایسی صورت حال میں اگر ہم وہ جرمانہ ادا کرنے پر تیار ہیں تو بورڈنگ کارڈ جاری کر دیتے ہیں۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے، اس کے بعد انھوں نے جانے دیا۔ لیکن سارا سفر اسی اندیشے میں گذرا کہ نمعلوم دوحہ ائرپورٹ پر ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو۔

دوحہ ائرپورٹ:۔ دوحہ ائرپورٹ بھی مطار دبی کی طرح بہت بڑا اور مصروف ہے، ہم پہلے اوپر والی منزل پر اترے، سیکورٹی چیک اِن کے بعد نچلی منزل پر آئے، جہاں ڈیوٹی فری شاپس بھی ہیں۔ وہاں سے مزید نچلی منزل (زمین کے ساتھ) پر آئے جہاں سے ہم نے نجف کے لیے اگلی پرواز پکڑنا تھی۔ ہمیں دروازہ C25 سے نکلنا تھا۔ ہم کچھ سہمے سہمے سے، کاونٹر پر پہنچے۔ وہاں ایک غیر ملکی بی بی بورڈنگ کارڈ چیک کر رہی تھی۔ اس نے نگاہ غلط انداز ہمارے بورڈنگ کارڈ پر ڈالی اور ہمارے نام پاسپورٹ سے ملائے اور ہاتھ سے جہاز پر سوار ہونے کا اشارہ کر دیا۔ یہ عمل کوئی دس بیس سیکنڈ میں انجام پایا ہو گا۔ لیکن ہمیں لگ رہا تھا کہ وقت رُک گیا ہے۔ دروازے کے اِس طرف آئے تو ہم نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ اسلام آباد ہوائی اڈے پر ہمیں جو ڈرایا گیا تھا ویسا کچھ نہ تھا۔

نجف اشرف ہوائی اڈہ:۔ پائلٹ نے جب اعلان کیا کہ ہم نجف ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں تو میں اشتیاق سے کھڑکی کے پاس آ بیٹھا تا کہ اوپر سے شہر پر ایک نظر ڈال سکوں۔ جب سواد شہر قریب آیا تو نیچے بکثرت کھجور کے باغات نظر آئے۔ آب پاشی کا بھی معقول نظام دکھائی دے رہا تھا۔ ایک بڑی نہر اور اس سے نکلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے پختہ کھالے ایک ترتیب سے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کر رہے تھے۔ دور سے حضرت علی کے مزار کا طلائی گنبد نظر آیا تو نگاہوں کو جھکا کر سلام پیش کیا۔ جہاز ٹھیک اپنے مقررہ وقت پر ساڑھے نو بجے صبح نجف ہوائی اڈے پر اتر گیا۔ ہوائی اڈہ زیادہ مصروف نہ تھا۔ تین جہاز اور کھڑے تھے۔ ایک ایران سے ہوا پیمائی ماہان کا، دوسرا دبی سے فلائی دبی کا اور تیسرا خود عراقی ائر ویز کا۔ ہوائی اڈے کا ہال چھوٹا سا ہے۔ ہم ہال میں آئے تو پہلے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ہمیں لینے آیا ہوگا اور اس کے ہاتھ میں ہمارے ناموں کی تختی ہوگی، لیکن ایسا کچھ نہ تھا۔ بغیر ویزا کے ہم باہر نکل نہیں سکتے تھے۔ کچھ پریشانی ہوئی۔ اب کیا کریں؟ باہر جانے کے لیے ویزا کا ہونا ضروری تھا۔ ہال میں ایک کھڑکی پر نظر پڑی جس پر لکھا تھا ویزا افس۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے رجوع کرتے ہیں۔ وہاں گئے اور اندر عتبہ عباسیہ کی طرف سے ایک آدمی کانفرنس کے مدعوئین کو ویزے جاری کروانے کے لیے بیٹھا تھا۔ اس نے ہمیں اہلاً وسہلاً کہا۔ ہم سے ویزا فارم پُر کروایا اور ویزا لگوا دیا۔ بعد میں ہم نے دیکھا کہ ایرانی زائرین کو لے کر جو جہاز آیا ہے اس کے تمام مسافر بلا ویزا آئے ہیں اور انھوں نے بھی یہیں سے ویزا لیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ عراقی ویزے کے لیے یہی معمول ہے اور سفارت خانے سے کم ہی ویزے جاری کیے جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے ہم جس روز اسلام آباد میں عراقی سفارت خانے گئے تھے وہاں ہمارے علاوہ ویزے کے لیے اور کوئی درخواست گزار نہ تھا۔ ہمارے ساتھ دوحہ سے کچھ ہندوستانی شکل وصورت اور لباس والے لوگ بھی نجف کے لیے جہاز پر سوار ہوئے تھے۔ ہمارا گمان تھا کہ یہ لوگ بھی کانفرنس کے مدعوئین ہوں گے۔ ہمارا گمان اس وقت صحیح نکلا جب نجف ہوائی اڈے پر وہ بھی اسی قطار میں آ کھڑے ہوئے جہاں سے ہم نے ویزا لیا اور ویزا افیسر کے پاس ان کے نام بھی ہمارے ناموں کی فہرست کے ساتھ ہی تھے۔ ان لوگوں سے وہیں تعارف ہو گیا۔ یہ احمد علی، سالار جنگ میوزیم کے شعبۂ مخطوطات کے کیپر تھے۔ موٹی آنکھیں، شیروانی اور پاجامہ زیب تن، جس سے ہندوستانی مسلمان دور ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ احترام علی خان، نواب سالار جنگ کے خاندان سے تھے اور سالار جنگ میوزیم کے بورڈ کے ممبر تھے، تازہ تازہ حج کر کے آئے تھے (ہم ۱۸ ذی الحجہ کو پہنچے تھے)، اپنا محلوق سر چھپانے کے لیے ہمیشہ ٹوپی پہنے رہتے۔ کُرتہ پاجامہ میں ملبوس ایک پھرتیلے میاں، ظفر یاب حیدر تقوی تھے۔ جب ہم سب کے ویزے لگ گئے تو یہ صاحب اپنا سفری لباس بدل کر، عبا اور عمامہ پہن کر آ گئے۔ علی احمد صاحب نے بتایا یہ ذاکرِ اہل بیت ہیں۔ بعد میں گاڑی میں ان کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا تو اپنے موبائل فون پر، اپنی ہی ریکارڈ شدہ تقریریں سن کر از خود راضی ہوتے تھے۔ ان تینوں سے الگ تھلگ ایک نوجوان

بیٹھے تھے۔ یہ ان کے ہندو ہم سفر پیرومل پالے سریش تھے، جو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کے شعبہ ڈاکومینٹیشن میں کام کرتے ہیں۔

نجف ہوائی اڈے پر کانفرنس والوں کی طرف سے جو شخص مأمور تھا، اس نے ہمارا خروج لگوانے میں مستعدی دکھائی اور پھر ہمیں ایک مخصوص کوچ میں بٹھا کر کربلا کی طرف روانہ کر دیا۔ ہم نجف کی شارع امام خمینی سے ہوتے ہوئے نجف-کربلا ہائی وے پر آ گئے۔ یہ دورویہ سڑک بہت اچھی تھی۔ نجف سے کربلا جاتے ہوئے دائیں طرف پورے راستے میں امام باڑے اور موکب تھے جن کے بارے میں ظفر یاب صاحب نے بتایا کہ یہ عاشورا اور اربعین کے ایام میں زائرین کی خدمت کے لیے کھول دیے جاتے ہیں اور یہاں زائرین کی فی سبیل اللہ میزبانی کی جاتی ہے۔ ظفر یاب صاحب نے بی بی سی اردو کے ''حوالے'' سے یہ بھی بتایا کہ گذشتہ سال اربعین (۲۰ صفر) کے موقع پر عراق میں چار کروڑ سے زائد زائرین آئے تھے۔ میں نے اسے مبالغہ قرار دیا تو برامان گئے۔ چار کروڑ تو عراق کی کل آبادی نہیں ہے، اتنے لوگوں کا کربلا، نجف اور کاظمین جیسے چھوٹے چھوٹے شہروں میں سمانا کیسے ممکن ہے۔ والعہدۃ علی الراوی.

نجف سے ہم کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں کربلا پہنچے۔ کربلا میں ہمارا قیام فندق ارض النور میں تھا۔ یہ ہوٹل باب بغداد میں ساحۃ باب بغداد (باب بغداد کی چورنگی) پر واقع تھا۔ اس چورنگی پر ایک فوارہ کے آثار قدیمہ تھے جو اپنی خشکی پر آنسو بہا رہا تھا۔ بعد میں دیکھا تو پورا علاقہ ہی ایسا تھا دھول میں اٹا ہوا، گویا یہاں کئی برس سے بارش برس کر نہیں گئی۔ ہر طرف سوکھے پن کا احساس ہوتا تھا۔ ہمارا ہوٹل دو سڑکوں کے سنگم پر واقع تھا، جہاں سے ایک سڑک امام حسین کے روضہ کی طرف اور دوسری حضرت عباس کے روضے کی طرف جاتی تھی۔ مجھے اور ڈاکٹر احمد خان کو ایک ہی کمرہ (نمبر ۲۰۸) دیا گیا۔ ہوٹل برا نہیں تھا، یہاں کے بیرے اور صفائی کرنے والے سب بنگلا دیشی تھے۔ ایک کا نام شہید الاسلام تھا جو ٹوٹی پھوٹی اردو بھی جانتا تھا۔

حضرت عباس اور امام حسین کے مزارات:۔ شیعہ حضرات ائمہ کے مزارات کو اصطلاحاً ''حرم'' کہتے ہیں۔ مشہد میں واقع امام رضا کے مزار کو ایرانی ''حرم رضوی'' پکارتے ہیں۔ عراق میں واقع ائمہ کے مزارات کو ''عتبہ'' بلاتے ہیں اور مجموعی طور پر عراق میں واقع تمام مزارات کو احتراماً ''عتبات عالیات'' کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ''کربلائے معلّی'' کہا جاتا ہے لیکن یہاں ہر جگہ ''کربلای مقدسہ'' لکھا دیکھا۔

مغرب کے وقت، میں اور ڈاکٹر خان، ہوٹل سے بائیں جانب کی سڑک پر مزار کو جانے کے لیے نکلے، جو سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ عتبہ عباسیہ ہے یعنی حضرت عباس بن حضرت علی کا روضہ ہے۔ یہ عتبہ ایک گول عمارت ہے جس پر منقش نیلی ٹائلوں کا نفیس کام ہوا ہے اور ہر طرف متعدد داخلہ دروازے ہیں، کچھ مردوں کے لیے

اور کچھ عورتوں کے لیے۔ ہر دروازے کا اپنا ایک نام ہے۔ باہر سے پوری عمارت ایک گول برآمدے کی شکل میں ہے، جس میں زائرین کے جوتے رکھنے کے لیے کیبن بنے ہیں۔ اسے یہاں ''کشوانیہ'' کہا جاتا ہے۔ جوتے سنبھالنے کی خدمت بلا اجرت ہے۔ جوتے کشوانیہ میں رکھوانے کے بعد جسمانی تلاشی کے بعد کسی بھی دروازے سے اندر داخل ہوں تو اندر صحن میں قالین بچھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں زائرین نماز، قرآن اور دعائیں پڑھتے نظر آتے ہیں۔ نماز کے وقت یہ پورا صحن، نماز گاہ بن جاتا ہے۔ حضرت عباس کا مزار صحن کے درمیان میں ہے اور آس پاس مدوّر عمارت کے اندرونی حصے میں انتظامیہ کے متعدد دفاتر ہیں، جن کے دروازے صحن ہی میں کھلتے ہیں۔ ہم جب صحن میں داخل ہوئے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور نمازی صف بندی کر رہے تھے۔ کیمرا میرے پاس تھا، میں نے فلم بنانا شروع کی تو سیکورٹی کا ایک آدمی میرے پاس آیا اور کیمرا مجھ سے لے کر مجھے اپنے دفتر میں لے گیا اور عربی میں سوال کرنے لگا۔ جب میری طرف سے عربی میں جواب نہ ملا تو انگریزی بولنے لگا کہ تم یہ کیمرا اندر کیسے لائے؟ کیوں کہ کیمرہ اور موبائل اندر لانا منع ہے۔ میں نے کہا ہاتھ میں پکڑ کر۔ ظاہر ہے یہ ان کے سیکورٹی سسٹم کی کمزوری تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کیمرا اندر نہیں لے جایا سکتا۔ اس نے وقت معلوم کیا کہ میں کب مزار کے احاطے میں داخل ہوا ہوں تا کہ اس وقت ڈیوٹی پر موجود سیکورٹی عملہ کو تنبیہ کی جا سکے۔ مجھ سے یہ تفتیش جاری تھی کہ ایک اور سیکورٹی والا ایک عراقی زائر کو پکڑ کر اندر لے آیا اور شکایت کی کہ یہ روضے کی جالی سے اپنی کمر بُری طرح رگڑ رہا تھا جس سے بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے۔ سیکورٹی والے نے اس زائر کی نقل بھی اتار کر دکھائی۔ اب جو افسر مجھ سے تفتیش کر رہا تھا، وہ مجھے چھوڑ کر اُدھر متوجہ ہو گیا اور اس سے بے کار کی بحث کرنے لگا جس نے کوئی آدھ گھنٹہ طول کھینچا۔ میں درمیان میں ٹوکتا کہ میرا مقدمہ تو نمٹاؤ، لیکن وہ ہاتھ کے اشارے سے صبر کی تلقین کرتا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ سیکورٹی والے محض اپنے اختیار کے استعمال کی تسکین کے لیے تفتیش کو طول دے رہے ہیں۔ ورنہ معاملہ سیدھا سادا ہے کہ آپ انجان لوگوں کو خبردار کر کے چھوڑ دیں۔ یہ سیکورٹی والے بالکل بھی ایسے معاملات نمٹانے کے اہل نہ تھے اور محض اپنا رعب داب دکھانے کے لیے معاملے کو طول دیتے تھے۔ مجھے بہت کوفت ہوئی۔ خیر مجھے بہت لیت ولعل کے بعد کیمرا واپس کیا گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میں اس کے بعد بھی کئی بار یہاں آیا اور کیمرا ساتھ ہی لاتا تھا اور سیکورٹی والے چیک نہیں کرتے تھے۔ ہاں، اب احتیاط یہ کرتا تھا کہ مزار کے احاطے میں تصویر نہیں بناتا تھا۔

حضرت عباس کے مزار پر فاتحہ خوانی کر کے باہر نکلے اور امام حسین کے روضے کا پوچھا۔ کسی نے ہاتھ کا اشارہ کر کے بتایا وہ سامنے ہے۔ ان دونوں مزارات کے درمیان کا علاقہ ''بین الحرمین'' کہلاتا ہے۔ یہ سنگ مرمر کے فرش کا چند سو گز کا راستہ ہے، جس کے دونوں طرف کھلے برآمدے ہیں۔ اس راستے اور برآمدے میں زائرین بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے آرام کے لیے بڑے بڑے برقی پنکھے نصب ہیں، جو پانی کی پھوار پھینک رہے تھے۔ اکتوبر کے باوجود ان

دنوں کربلا کا درجۂ حرارت چالیس سینٹی گریڈ سے کم نہ تھا۔عتبہ حسینیہ کی عمارت بھی ہو بہو عتبہ عباسیہ کی طرح گول اور نیلی ٹائلوں سے آراستہ ہے۔ یہاں کشوانیہ میں جوتے جمع کرا کے ہم اندر داخل ہوئے ۔ پہلے ایک مزار آیا جہاں بہت ہی کم لوگ تھے۔ہم نے امام حسین کا مزار سمجھ کر فاتحہ خوانی کی اور ساتھ ہی تعجب کا اظہار کیا کہ اتنے کم زائرین کیوں ہیں؟ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ امام زادہ علی اکبر کا مزار ہے، امام حسین کا مزار اس سے آگے ہے، جہاں زائرین کا ہجوم تھا۔ یہاں سب مزارات پر سنہری جالی لگی ہے، جسے ''ضریح'' کہا جاتا ہے۔زائرین ضریح کو چھو رہے تھے اور چوم رہے تھے۔ایسے ہجوم میں آگے جانا ممکن نہ تھا۔ہم نے قدرے فاصلے سے ہی فاتحہ خوانی کی۔

عتبہ حسینیہ میں مدفون شیعہ علما:۔ قدیم زمانے سے روایت رہی ہے کہ شیعہ علما، عمائد اور عام لوگ بھی (جو با وسائل تھے) اپنے اپنے علاقوں سے ہجرت کر کے عتبات آجاتے، یہیں زندگی بسر کرتے اور یہیں وفات پا کر عتبات کے قرب و جوار میں دفن ہو جانا سعادت سمجھتے۔بعض شیعہ علما اور عمائد ایسے بھی ہیں جنھوں نے وفات تو اپنے علاقے میں پائی، لیکن وصیت کی کہ انھیں نجف یا کربلا میں دفن کیا جائے۔تذکرے ایسے لوگوں کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔اِس وقت عرفی شیرازی یاد آرہے ہیں جو پہلے لاہور میں دفن ہوئے بعد میں ان کی ہڈیاں، ان کی وصیت کے مطابق نجف لے جا کر زمین میں دبائی گئیں۔

بہ کاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند بہ خاکم کنی و گر بہ تتار

(ترجمہ: اگر مجھے ہندوستان یا تاتارستان میں سپرد خاک کیا گیا تب بھی، میں پلکوں سے زمین کھود کر اپنی قبر سے نجف جا پہنچوں گا۔)

کربلا میں عتبہ حسینیہ کی زیارت کے وقت یہاں کئی جگہوں پر علما کی قبروں کے کتبات نظر آئے۔قبروں کے نشانات تو نہیں ہیں لیکن اس جگہ دیوار پر کتبات لگا کر نشان دہی کر دی گئی ہے۔یہ بھی مستحسن ہے ورنہ آل سعود نے جنت معلا اور جنت البقیع میں اکابر کی قبور کے ایسے تمام نشانات مٹا دیے ہیں۔امام حسین کے روضہ کے صحن میں مختلف جہتوں میں قبور کے یہ کتبات دیکھے: میرزا محمد شفیع تبریزی ثقۃ الاسلام وفات شوال ۱۳۰۱ھ، اس قبر کا کتبہ ایک بڑے داخلی دروازے کے کھلے کواڑ کے عین پیچھے چھپا ہوا ہے اور محض اتفاق سے میری نظر اس پر پڑ گئی۔اگر کواڑ بند کیا جائے تو کتبہ پورا نظر آئے گا۔یہ ایک طویل کتبہ ہے اور خط نستعلیق کی عمدہ مثال ہے۔اس کے بالمقابل ایک دیوار پر یہ اسما کندہ تھے۔زین العابدین مازندرانی وفات ۱۳۰۹ھ، غلام علی اردکانی وفات ۱۲۹۷ھ، علی بن زین العابدین مازندرانی وفات ۱۳۴۵ھ، محمد حسین ہمدانی کاظمی ۱۳۱۶ھ۔روضہ کی ایک اور سمت میں یہ کتبات دیکھے: سید عبداللہ بحرانی ۱۲۱۰ھ، سید محمد بحرانی ۱۲۵۵ھ۔ان لوگوں کی

نسبتِ مکانی سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ایرانی شیعہ علما، عتبات میں زندگی گذارنا اور یہیں دفن ہونا پسند کرتے تھے۔

بغداد جانے کی حسرت:۔ کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ۱۳ اکتوبر کا دن خالی تھا۔ میں نے کربلا پہنچتے ہی، منتظمین کے ہاں درخواست ڈال دی کہ اس خالی دن کے استعمال کے لیے مجھے بغداد جانے دیا جائے۔ پہلے تو یہ لوگ آمادہ ہو گئے اور ایک آدمی کو متعارف بھی کر دیا کہ یہ کل صبح صبح مجھے لے جائے گا۔ لیکن بعد میں مجھ سے پوچھا کہ بغداد میں کہاں جانا ہے؟ میں نے مشایخ سلسلۂ قادریہ اور دیگر اکابر طریقت کے مزارات کی ایک فہرست ان کے ہاتھ میں تھما دی۔ طویل فہرست دیکھ کر منتظمین کچھ بدک گئے اور یہ کہہ کر جانے سے روک دیا کہ وہاں امن وامان کا مسئلہ ہے۔ آپ ہمارے عزیز مہمان ہیں، آپ کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔ ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔ میں خاموش ہو گیا، لیکن دل میں بہت افسوس ہوا کہ بغداد شریف کے اتنے قریب آ کر بھی اپنے مشایخ سلسلہ کے مزارات کی زیارت سے محروم رہا۔ معلوم نہیں دوبارہ آنا ہو یا نہ؟ میں جب تک عراق میں رہا یہ احساس محرومی یا حسرت دل کو ٹھیس پہنچاتی رہی۔ میں چاہتا تو خود بھی ٹیکسی لے کر جا سکتا تھا لیکن یہ میزبانوں کے آداب کے خلاف ہوتا۔

عتبہ عباسیہ کا کتب خانہ:۔ یہ خالی دن (۱۳ اکتوبر) میں نے اور ڈاکٹر خان نے عتبہ عباسیہ کے کتب خانہ میں گذارنے کا فیصلہ کیا۔ میں پاکستان سے حضرت شرافت نوشاہی کی اردو تصنیف **تاریخ عباسی** (مطبوعہ) کا ایک نسخہ اس نیّت سے ساتھ لایا تھا کہ عتبہ عباسیہ کے کتب خانے کو پیش کروں گا، کیوں کہ یہ کتاب براہ راست حضرت عباس سے متعلق ہے اور یہ کتب خانہ، اس کتاب کے لیے موزوں ترین جگہ تھی۔ وہ نسخہ ساتھ لیا اور ہوٹل میں ناشتے کے بعد کتب خانے پہنچے۔ وہاں عمامہ اور عبا میں ملبوس ایک صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ انھوں نے اپنا نام محمود الصافی بتایا۔ میں نے انھیں کتاب پیش کی اور اس کے موضوع کے بارے میں بھی وضاحت کی کہ یہ برّ صغیر، بالخصوص پنجاب میں حضرت عباس کی اولاد (سادات علوی) کا تذکرہ ہے اور اس میں میرے آبا واجداد بھی شامل ہیں۔ میرا یہ جملہ سن کر انھوں نے تاکیدی اور تائیدی انداز میں پوچھا: ''انت من ذریۃ حضرت عباس؟'' (کیا آپ حضرت عباس کی نسل سے ہیں؟) میرا تائیدی جواب سن کر انھوں نے میرا ادب کچھ سوا کیا اور کہنے لگے ہم تو حضرت عباس کے خادم ہیں۔ مجھے اس صورت حال سے شرمندگی ہوئی، کیونکہ میں نسلی تفاخر کا قائل نہیں ہوں۔ محمود الصافی خود عالم تھے اور ان کا احترام مجھ پر واجب تھا۔ انھوں نے کتب خانے کے بارے میں بتایا اور کچھ نوادر مخطوطات کے عکس بھی دکھائے۔ ملاقات میں کسی طرح ایک ایرانی شیعہ عالم، آقا بزرگ طہرانی کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے صافی صاحب کو بتایا کہ میں آقا بزرگ طہرانی کے دونوں بیٹوں (علی نقی منزوی اور احمد منزوی) کی صحبت میں رہا ہوں اور ان کے چھوٹے بیٹے احمد منزوی کا فہرست نگاری میں براہ راست شاگرد ہوں۔ چونکہ صافی صاحب، آقا بزرگ طہرانی کے بہت عقیدت مند تھے، مجھ سے یہ اطلاع پا کر بہت پر جوش اور خوش

ہوئے اور اسی وقت ایک کاغذ پر اپنا اور اپنے والد کا نام (علامہ شہید شیخ عبدالرضا صافی) لکھ کر مجھے دیا اور کہا کہ کل جب میں کانفرنس میں شرکت کے لیے یہاں آؤں تو ان کے لیے اجازہ لکھ کر لاؤں۔ میں نے کہا میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کے لیے اجازہ لکھوں، لیکن وہ مصر رہے۔ یہ ان کی علمی شان تھی۔ آقا بزرگ کا ذکر جاری تھا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ایرانی ہونے کے باوجود، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سامرہ اور نجف میں گذرا ہے لیکن ان کے مدفن کے بارے میں استحضار نہ تھا۔ میں نے صافی صاحب سے پوچھا، آقا بزرگ کی قبر کہاں ہے؟ کہنے لگے: نجف میں۔ میں نے کہا اس کی کوئی نشانی؟ انھوں نے کاغذ پر مکمل پتا لکھ دیا۔ بس اسی وقت سے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوگئی کہ نجف کے سفر میں آقا بزرگ کی قبر پر ضرور جاؤں گا۔ بلکہ اگر سچ پوچھیں تو حضرت علی کے مزار کے بعد اگر کسی جگہ بالارادہ جانا تھا تو وہ آقا بزرگ کی قبر تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

مخطوطات کانفرنس: ۔۴-۱۵ اکتوبر کے دن کانفرنس میں گذر گئے۔ یہ عتبہ عباسیہ کے امام حسن ہال میں منعقد ہوئی۔ ہال بہت خوبصورت اور گنجایش کے لحاظ سے مناسب تھا۔ اسٹیج پر رکھی میز پر ان سب ملکوں کے پرچم رکھے گئے تھے جن کے شرکا یہاں موجود تھے۔ پاکستان کا پرچم بھی نمایاں تھا۔ پروگرام کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ اس کے بعد عراق کا قومی ترانہ بجایا گیا اور شہدائے اسلام اور عراق کے لیے فاتحہ پڑھی گئی۔ یہ اس سلسلے کی دوسری کانفرنس تھی جس کا عنوان تھا: ''التراث المخطوط فکر وحضارۃ Manuscript heritage is intellect and civilization''۔ کانفرنس کا افتتاحی خطبہ ترکی سے آئے ڈاکٹر خالد ارن نے دیا جو اسلامی ممالک کی تنظیم کے ثقافتی اور تاریخی ادارہ IRCICA کے سربراہ ہیں۔ ان سے میں چند سال پہلے ہی استنبول کے ایک سفر میں مل چکا تھا لیکن یہاں نہ انھوں نے مجھے پہچانا، نہ میں نے ان کو۔ ڈاکٹر خان کے وہ پرانے دوست نکلے۔ کانفرنس کے پہلے دن زیادہ تر مقالات فنی نوعیت کے تھے کہ مخطوطات کو قدرتی آفات سے کیسے محفوظ کیا جائے اور آفت زدہ مخطوطات کو دوبارہ کیسے بحال کیا جائے۔ دوسرے دن تمام مقالات، مخطوطات کی تدوین اور علمی لحاظ سے ان کے احیا کے بارے میں تھے۔ مقالات سب کے سب عربی میں تھے، سوائے احمد علی (ہندوستان) کے مقالہ کے کہ وہ انگریزی میں تھا۔ احمد علی صاحب کی بھی سنیے۔ جس روز انھوں نے اپنا مقالہ پڑھنا تھا، صبح صبح میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ وہ قند کے مریض ہیں اور آج اس مرض نے ان کی بینائی پر حملہ کیا ہے اور وہ بہت کم دیکھ پا رہے ہیں اور مقالہ نہیں پڑھ پائیں گے۔ اگر ان کی جگہ میں مقالہ پڑھ دوں تو کارروائی ہو جائے گی۔ میں ہامی بھر لی اور ان سے مقالہ لے کر جلدی سے اس کا ایک ملخص تیار کیا اور پڑھ دیا۔ ہمارے عراقی میزبان، ہندوستان اور پاکستان کے سیاسی اختلافات کی تاریخ سے آگاہ تھے۔ انھوں نے برملا ایک پاکستانی کی طرف سے ایک ہندوستانی کی مدد کو پہنچنے کو سراہا۔ حالانکہ میرے ذہن میں ایسے کسی اختلاف کی کوئی بازگشت نہ تھی اور یہ کام محض انسانی ہمدردی کے طور پر اور احمد علی

صاحب کی شرافت کو پیش نظر رکھ کر کیا تھا۔

اس کانفرنس میں رسمی طور پر بلائے گئے شرکا کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہوگی، لیکن ان سب سے مقالے نہیں مانگے گئے تھے۔ ہم دونوں پاکستانی شرکا بھی بغیر مقالے کے شریک ہوئے اور محض سامع تھے۔

کانفرنس میں اگرچہ عربی سے انگریزی ترجمے کا انتظام موجود تھا لیکن مترجم، مقرر سے پیچھے رہ جاتا اور درمیان میں مفہوم غت ربود (غتربود) ہو جاتا اور ترجمہ بھی صحیح نہ تھا۔ کانفرنس میں چند ایرانی دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ کچھ سے میں ایران میں مل چکا تھا، کچھ ایرانی، میرے نام سے واقف تھے اور کچھ سے میں غائبانہ واقف تھا لہذا کسی سے تکلف نہ تھا۔ ان دوستوں کے اسما یہ ہیں۔ سید علی موجانی (تہران)، امید علی مقیمی (رے)، رضا ہادی زادہ (اصفہان)، سید محمد رضا فاضل ہاشمی (مشہد)، محرم صادق زادہ (تہران)، حسین متقی (قم)، رضا طالعی۔ ایرانیوں کے کانفرنس میں آنے سے میری بند زبان بھی کھل گئی۔ ورنہ اس سے پہلے سارا ماحول ''دہان پُر از عربیست'' والا تھا۔ میں اس ماحول میں عجمی تھا۔

کانفرنس کے دونوں ایام میں شرکا کو عتبہ عباسیہ کے ''لنگر خانہ'' سے کھانا کھلایا گیا۔ یہ بالکل سادہ کھانا تھا اور بیٹھنے کی جگہ بھی سادہ تھی۔ پہلے دن مسور پلاو تھا اور دوسرے دن مرغ پلاو، ساتھ بینگن کا شوربہ اور دہی۔

شعبۂ مخطوطات اور ''مرکز ترمیم المخطوطات وصیانتہا'':۔ کانفرنس کے دوران ہمیں عتبہ عباسیہ کا شعبۂ مخطوطات اور ''مرکز ترمیم المخطوطات وصیانتہا'' بھی دکھائے گئے۔ شعبۂ مخطوطات میں شیشے کے شوکیسوں میں منتخب عربی اور فارسی نسخے نمائش کے لیے رکھے تھے۔ میری توجہ کا مرکز امام غزالی کی **کیمیاے سعادت** کا ایک قدیم نسخہ رہا جسے خود شعبہ مخطوطات والوں نے چھٹی صدی ہجری کا قرار دے رکھا تھا۔ اس نسخے میں بالالتزام دال کو ذال کتابت کیا گیا ہے۔ جو صفحہ سامنے کھلا تھا اس میں یہ مثالیں موجود تھیں : شوذ (شود)، بدیذ (پدید)، باشذ (باشد)، بایذ (باید)، بوذ (بود)، بذان (بدان)، پرسیذند (پرسیدند)، پیذا (پیدا)، مانذ (ماند)۔ اس نسخے کے رسم الخط کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ گ (گاف) پر کش کے بجاے تین نقطے ڈالے گئے تھے اور ''کہ'' کی جگہ ''کی'' لکھا ہوا تھا جیسے: ''بل کی خوذ آن نعمت نداند کی باشذ کی آن است۔'' کاتب نے اس نسخے میں اعراب لگانے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ اگرچہ **کیمیاے سعادت** کا تنقیدی ایڈیشن حسین خدیو جم نے مرتّب کیا ہے اور، تہران سے متعدد بار چھپ چکا ہے، تاہم آئندہ کسی ایڈیشن میں عتبہ عباسیہ کے نسخے کو بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ نسخے کے حجم سے لگ رہا تھا کہ یہ محض ایک حصہ ہے اور مکمل نسخہ نہیں ہے۔ اس شعبے میں جن الماریوں میں نسخے رکھے تھے وہ سب متحرک تھیں۔ ہر الماری کے باہر ایک کلا تھی جسے مروڑا جاتا تو دو الماریوں کے درمیان راستہ بن جاتا اور آدمی اندر داخل ہو سکتا۔ جب اس کلا کو دوبارہ مروڑا جاتا تو یہ راستہ بند ہو جاتا اور تمام الماریاں ایک دیوار کی طرح نظر آتیں۔ الماریوں کی یہ ساخت جگہ کے کم سے کم استعمال کے لیے بہت کارآمد تھی اور حسب ضرورت آدمی کے

گذرنے کی جگہ بنائی جاسکتی ہے۔مخطوطات کی مرمت اور حفاظت کا شعبہ بھی جدید ساز وسامان اور کیمیاوی مادّوں سے آراستہ تھا۔اس شعبے نے قدامت سے جدت کا سفر کیسے طے کیا؟ اسے یاد رکھنے کے لیے پرانا ساز وسامان بھی نمایش کے لیے رکھا تھا۔اس میں ایک نمایاں چیز لکڑی کا وہ شکنجہ تھا جو جلد سازی میں استعمال ہوتا۔ایسا شکنجہ ہمارے گھر (ساہن پال) میں بھی ہے جسے ہمارے بزرگ کتابوں کی جلد بندی کے لیے استعمال کرتے تھے۔کرم خوردہ، کٹے پھٹے اوراق کی مرمت بہت محنت طلب اور باریکی کا کام ہے۔وہاں کچھ کارکن اس کام میں مشغول تھے اور بہت ہی باریک بینی سے یہ کام کررہے تھے۔شعبے میں مائیکروفلم بنانے کا یونٹ بھی تھا۔چند الماریوں میں دنیا بھر کے مختلف کتب خانوں کے مخطوطات کی فہرستیں رکھی تھیں۔پاکستان سے استاد احمد منزوی کی فہرست مخطوطات گنج بخش، خضر نوشاہی صاحب کی فہرست گنجینۂ آذر اور میری تیار کردہ تین مختلف فہرستیں (پنجاب یونیورسٹی، نیشنل آرکائیوز، گنج بخش میں مطبوعات فارسی) تھیں۔حالانکہ پاکستان میں فہرست نگاری کا کام اس سے کہیں زیادہ ہوا ہے۔

نجف اشرف کا سفر:۔کانفرنس کے جن شرکا نے نجف اشرف جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، ۱۶ اکتوبر کو انھیں دو کوچوں میں سوار کر کے نجف اشرف لے جایا گیا۔اس میں ہم پاکستانی، ہندوستانی، بحرینی، مصری اور ایرانی زائرین تھے۔ہماری کوچیں عتبہ علوی سے ذرا دور، ایک سڑک پر جا کر رک گئیں اور ہمارے راہ بروں نے ہمیں آزاد کر دیا اور کہا کہ دو گھنٹے آپ یہاں زیارات وغیرہ میں گذار کر واپس آجائیں۔ڈاکٹر احمد خان، علی احمد، سریش اور میں نے اپنی ٹولی بنائی۔کوچ جہاں رکی تھی وہاں سے ایک بازار سے گذر کر روضہ علوی تک جانا تھا۔اس بازار میں دائیں طرف سید الطائفہ بحرالعلوم اور سید الطائفہ الطّوسی کی قبروں کی نشاندہی ایک اونچی دیوار پر نصب خوبصورت نیلی ٹائلوں کے اندر لکھائی سے کی گئی ہے۔یہ دونوں اکابر شیعہ علما سے تھے۔شیخ طوسی (وفات: ۴۶۰ھ) کی کتابیں **التہذیب** اور **الاستبصار**، اہل تشیع کی کتب اربعہ میں سے دو ہیں۔

بازار کا راستہ طے کیا۔روضہ کی عمارت سے باہر ہی جوتیاں ڈالنے کے لیے پلاسٹک کے لفافے موجود تھے۔جوتیاں ان میں ڈال کر ویسے ہی باہر دیوار کے ساتھ رکھ دیں (جو الحمدللہ واپسی تک محفوظ تھیں) اور روضہ کی عمارت میں داخل ہو گئے۔یہ عمارت کربلا کے عتبات سے زیادہ وسیع نظر آئی۔قبر کی جالیاں تین اطراف سے مردوں اور ایک طرف سے عورتوں کی زیارت کے لیے کھلی تھیں۔یہاں زائرین، کربلا کے عتبات کی نسبت زیادہ تھے اور فضا میں حضوری کا ذوق بھی وہاں کی نسبت بیشتر تھا۔روضہ میں شیشہ کاری اور کاشی کاری کا کام بہت عمدہ تھا۔جگہ جگہ فانوس بھی لٹکے ہوئے تھے۔ہم نے جالیوں سے متصل ہی ایک کونے میں دو رکعت نفل ادا کیے اور فاتحہ خوانی کی۔چونکہ وقت کافی تھا ہم اسی کونے میں کچھ دیر بیٹھے رہے اور سامنے ضریح اور اس پر پروانہ وار زائرین کی حاضری کا نظارہ کرتے رہے۔پھر وہاں سے نکل کر باہر آئے تو ضریح کے داخلی دروازے پر دائیں بائیں علامہ حلی شیخ جمال الدین الحسین بن یوسف حلی ۶۴۸-۷۲۶ھ اور

علامہ شیخ احمد بن محمد اردبیلی مشہور بہ مقدس اردبیلی وفات ۹۹۳ھ کی قبریں دیکھیں۔علامہ حلی کے مزار کی طرف سے داخل ہوں تو باہر کی دیوار پر یہ فارسی اشعار ٹائلوں کی مدد سے لکھے ہوئے ہیں:

زائرانِ درگہت را بر درِ خلد برین
میدہند آوازِ طبّم فادخلوھا خالدین
تا نجف شد آفتاب دین و دولت را مقام
خاک آن دارد شرف بر زمزم و بیت الحرام

چونکہ ابھی کافی وقت باقی تھا۔ہم صحن کا چکر لگا کر ایک بار پھر ضریح تک آئے اور زیارت کی۔اس ضریح سے آگے ایک وسیع ہال برائے نماز ہے۔وہاں دو رکعت نفل ادا کیے اور ہم چاروں، دیے گئے وقت کے مطابق، دو گھنٹے گذار کر روضہ سے باہر آ گئے۔ یہاں شاید بعض قارئین کے ذہن میں سوال ابھرے کے ہمارے چوتھے ساتھی سریش کا وہاں کیا عمل تھا؟ وہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہی رہے لیکن خاموش تماشائی کے طور پر۔

ہم باہر سڑک پر اپنی کوچ تک آ چکے تھے لیکن ہمارے باقی ساتھیوں کی ابھی آمد نہیں ہوئی تھی۔ہمارے سامنے ہی وادی السلام قبرستان تھا اور اس کے داخلہ دروازے پر حضرت ہود اور صالح کے مزار کی نشان دہی کی گئی تھی۔ہم نے وہاں ایک دکان دار سے پوچھا کہ مزار کتنی دور ہے اس نے کہا زیادہ دور نہیں ہے۔میں اور ڈاکٹر خان پیدل چل پڑے تو سامنے ہی گنبد نظر آ گیا۔اندر داخل ہوئے تو دونوں پیغمبروں کی یکجا قبر شیشے کی تھی اور کرنسی نوٹوں سے لبالب بھری ہوئی تھی، لگتا تھا نوٹوں کی قبر ہے! وہاں کوئی اور زائر نہ تھا۔قبر کے قریب ''عکس برداری ممنوع'' کا بورڈ آویزاں تھا۔لیکن ہم تصویر بنانا چاہتے تھے۔دور داخلہ دروازے پر چوکی دار اونگھ رہا تھا۔ہم نے اس سے اجازت لینا مناسب سمجھا۔اس نے اونگھتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کچھ اس طرح کیا کہ جاؤ جو مرضی ہے کرو، لیکن مجھے نہ جگاؤ! میں نے چند تصویریں بنائیں۔وادی السلام بیس کلو میٹر پر محیط قدیم قبرستان ہے جس میں دو تین منزلہ قبریں بھی ہیں۔اس قبرستان میں بہت صلحا، علما اور شہدا دفن ہیں۔

آقا بزرگ طہرانی کی قبر پر:۔عتبۂ علوی دیکھ چکے، اب آقا بزرگ کی قبر دیکھنے کی خواہش پورا کرنے کا وقت تھا۔یہ صرف میری اور ڈاکٹر خان کی خواہش تھی۔باقی قافلے کو اس کا علم نہ تھا اور وہ لوگ شاید آقا بزرگ سے اتنے واقف بھی نہ ہوں یا دل چسپی نہ رکھتے ہوں۔میں اور ڈاکٹر خان چونکہ دونوں فہرست نویس اور کتابیات کے آدمی ہیں، ہمارا واسطہ ہر وقت آقا بزرگ کی دو کتابوں سے رہتا ہے۔ایک **الذریعہ الی تصانیف الشیعہ** (۲۵ جلدیں) اور دوسری **طبقات اعلام الشیعہ** (متعدد جلدیں)۔ان کتب کی تصنیف، شیعہ تراث کے لیے آقا بزرگ کی ایسی خدمت ہے جس کی کوئی نظیر عالم تشیع میں نہیں ملتی۔اگر یہ کہا جائے کہ آقا بزرگ، شیعہ حلقے کے حاجی خلیفہ (صاحبِ **کشف الظنون**) ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔میں اپنی کتابی

زندگی میں انھی کتابوں کے ساتھ بڑا ہوا ہوں اور ایک طرح سے یہ میری ہمدم و مونس ہیں۔ آقا بزرگ کے دونوں بیٹوں کے ساتھ جو تعلق رہا، اس سے بھی آقا بزرگ سے مزید انس پیدا ہوا۔ بہرحال آقا بزرگ ایک بہت بڑے عالم دین اور کتاب شناس تھے، ان کے شہر میں آکر ان کی آخری آرام گاہ دیکھے بغیر کیسے جا سکتا تھا۔ میں نے کاغذ کی وہ پرچی اپنے راہ بر کے آگے کر دی جس پر محمود الصافی نے مجھے اس آرام گاہ کا پتا لکھ کر دیا تھا: ''مقبرۃ و مکتبۃ العلامہ آغا بزرگ الطہرانی، نہایۃ شارع الرسول، جہۃ الجدیدۃ الاولی، بالقرب من برای السید السبز واری۔'' راہ بر نے کہا یہ ہمارے راستے میں ہی ہے۔ کوچ شارع رسول کی انتہا پر رکی اور ہم ایک دو آدمیوں سے پوچھتے تاچھتے ایک دو منزلہ مکان (جس کا ایک تہ خانہ بھی تھا) تک پہنچ گئے۔ مکان کی دونوں منزلوں کی دیوار پر سیمنٹ کا خالی پلستر ہوا تھا اور یہ کوئی شاندار مکان نہ تھا۔ پلستر شدہ دیوار پر دو فلیکس بورڈ آویزاں تھے۔ ایک پر یہ عبارت درج تھی: ''المرقد المطہر للعلامۃ الشیخ آغا بزرگ الطہرانی (قدس سرّہ) صاحب کتاب الذریعۃ الی تصانیف الشیعۃ، المتوفی فی یوم ۱۳ ذی الحجۃ فی سنۃ ۱۳۸۹ھ۔'' دوسرے فلیکس پر آقا بزرگ کی تصویر چھپی تھی جو میرے لیے جانی پہچانی تھی۔ اس تصویر میں وہ دری پر بیٹھے ہیں، پیچھے ایک تکیہ ہے، اس سے ٹیک لگائے، اپنے زانو پر کاغذ رکھ کر لکھ رہے ہیں اور آس پاس کاغذ پڑے ہوئے ہیں۔ اس تصویر میں ان کی عمر اسّی سال سے اوپر دکھائی دیتی ہے اور آدمی یہ تصویر دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اس عمر میں بھی کس انہماک سے علمی کام کرتے ہیں۔ یہی تصویر **الذریعہ** کے ساتھ بھی چھپتی رہی ہے۔ خیر، مکان پر تالا پڑا تھا اور ہم اندر جا کر قبر نہیں دیکھ سکے۔ لیکن یہی کیا کم تھا کہ اس مکان تک آ گئے جہاں آقا بزرگ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہاں آ کر مجھے تو بہت طمانیت اور شرف کا احساس ہوا۔ بہت پہلے استنبول میں حاجی خلیفہ کی قبر ڈھونڈ کر، وہاں گیا تھا۔ اسے دیکھ کر بھی بہت فخر کا احساس ہوا۔ یہ اکابر، ہماری علمی تاریخ کے ایک طرح سے تاریخ نویس ہیں۔ وہ تاریخ، جو واقعات کے ذریعے نہیں، بلکہ کتابوں کی تصنیف کی روداد کے ذریعے بیان ہوئی ہے۔ کس نے کیا لکھا؟ کیوں لکھا؟ کہاں لکھا؟ کب لکھا؟ ان سوالوں کے جواب ہمیں انھی مورخین کی کتب سے ملتا ہے۔

دارالتراث کا کتب خانہ: شیخ آقا بزرگ کا مکان اور آخری مقام دیکھ چکے تو نجف میں ہمیں ایک علمی ادارے ''دارالتراث'' لے جایا گیا۔ یہ ادارہ، تراثِ اسلامی کی حفاظت کا داعی ہے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اس کے وسیع ہال میں داخل ہوئے تو پہلے ہال میں مطالعے کی میزیں تھیں۔ اگلے ہال میں شوکیسوں میں پرانا استعمال شدہ سامان نوشت و خواند رکھا تھا جس سے اندازہ ہو سکے کہ اب دنیا کس قدر بدل چکی ہے۔ قلم دان، دواتیں، قلم تراش وغیرہ۔ اسی ہال میں شیعہ مشاہیر، علما اور مصنفین کی تصاویر کے فلیکس رکھے ہوئے تھے۔ ایک تصویر دور سے شاہ ایران محمد رضا پہلوی کی لگ رہی تھی۔ حیرت ہوئی کہ اس تصویر کا یہاں کیا کام؟ نزدیک گیا تو یہ عراق کے معروف عیسائی مورّخ کورکیس عواد (۱۹۰۸-۱۹۹۲ء) کی تصویر تھی جس کی حیرت انگیز شباہت شاہ ایران سے تھی۔ اس کی تائید ڈاکٹر احمد خان نے بھی کی۔ کتابیں بھی اسی ہال میں تھیں۔ اس

ہال کے بغل میں اور کئی چھوٹے چھوٹے ہال تھے جو کتابوں اور رسائل سے بھرے ہوئے تھے۔ دارالتراث کے مدیر نے دو چیزیں خاص طور پر دکھائیں۔ ایک کورکیس عواد کا ذخیرۂ کتب اور ذاتی کاغذات، جو ابھی تک غیر مرتّب پڑے تھے۔ اس ذخیرے کا ایک اہم حصہ قدیم سنگی چھاپہ کتب پر مشتمل تھا۔ دارالتراث کا دوسرا اہم کام عربی علمی رسائل کی عکسی نقول کی فراہمی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ایسے تحقیقی رسائل کی مکمل فائلیں یہاں دستیاب ہوں۔ ان رسالوں کی عمدہ عکسی نقلیں تیار کر کے جلدیں بندھوائی گئی ہیں۔ اب اصل اور نقل میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ڈاکٹر احمد خان کو کسی رسالہ کی تلاش تھی وہ انھیں مل گیا۔ حجم کے اعتبار سے اگرچہ یہ کوئی بڑا ادارہ نہیں تھا، لیکن اس کی جہت اور مقاصد قابل ستایش تھے اور آیندہ چل کر ایک عمدہ تحقیقی مرکز میں ڈھل جائے گا۔ اس ادارے کی کچھ اپنی مطبوعات بھی ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ میں نے ایک چیز پر توجہ دی اور وہ یہ کہ کتب خانے میں موجود ہزاروں کتب کی ابھی تک موضوع بندی نہیں کی گئی تھی اور نہ ہی ان کو رجسٹر پر چڑھایا گیا تھا۔ کتابیں ویسے ہی بلاترتیب رکھی تھیں۔

دارالتراث دیکھنے کے بعد دوپہر کا کھانا نجف کے ایک جدید رستوران سوباط میں کھایا۔ یہاں بھی بیرے پاکستانی اور بنگالی تھے۔ کھانے کی فراوانی تھی اور بہت سا بچ گیا۔ اس اسراف اور ضیاع پر بہت افسوس ہوا۔

کوفہ:۔ کھانے کے بعد ہم کوفے کی طرف روانہ ہوئے اور میثم تمار کے مزار کے پاس سے گذرتے ہوئے، حضرت مسلم بن عقیل کے روضے پر پہنچے۔ مسلم بن عقیل، امام حسین کے چچازاد تھے اور جنگ کربلا سے پہلے امام حسین کے سفیر اور قاصد بن کر کوفہ گئے تھے تاکہ اہل کوفہ کو امام حسین کی حمایت کی تاکید کر سکیں، مسلم بن عقیل کے روضے کی بہت شاندار اور خوبصورت عمارت ہے جس کا ایک وسیع صحن ہے۔ مسلم بن عقیل کے روضے کے عقب میں مختار بن ابوعبیدہ ثقفی کا چھوٹا سا مزار ہے۔ مختار ثقفی، تاریخ میں بنوامیّہ سے امام حسین کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے معروف ہیں۔ مسلم بن عقیل کے مزار کے بالمقابل، صحن کی دوسری طرف، ہانی بن عروہ کا مزار ہے۔ جب ابن زیاد، کوفہ کا گورنر بنا تو مسلم بن عقیل، جو سفیر امام حسین کے طور پر کوفہ میں تھے، ہانی بن عروہ کے گھر میں روپوش ہوئے تھے۔ مسلم بن عقیل کے مزار کا صحن عبور کر کے دوسری طرف جائیں تو ساتھ ہی مسجد کوفہ ہے جس پر ''انانۃ مسجد الکوفہ'' کا پتھر نصب ہے۔ مسجد کا صحن بہت کھلا اور اس کے چاروں طرف مسقّف برآمدہ ہے۔ مسلم بن عقیل کے مزار سے مسجد کے صحن میں داخل ہو کر ہم اپنے بائیں ہاتھ گئے۔ اس مسقّف عمارت میں ایک جگہ کو شیشے اور جالی سے محفوظ کیا گیا ہے جس کے بارے میں بتایا گیا کہ یہاں حضرت علی پر نماز کے دوران تلوار سے وار کیا گیا (۱۹ رمضان ۴۰ ھ) اور دو روز بعد وہ اسی زخم کی تاب نہ لا کر شہادت پا گئے (۲۱ رمضان)۔ گویا یہ مقام، ضربت خوردن حضرت علی ہے۔ مسجد کے اسی حصے میں ایک دیوار پر مقام نوح اور ایک ستون پر مقام زین العابدین لکھا تھا۔ دونوں جگہ پر دو دو رکعت نفل ادا کیے۔ بتایا گیا کہ اسی مسجد میں مقام ابراہیم اور مقام خضر بھی ہے لیکن ہم وہ نہ دیکھ

پائے۔جن مقامات اور مزارات کا ذکر ہوا ہے اس کی توثیق میں نہیں کرسکتا اور نہ اس بارے میں تاریخی سند کا مجھے کچھ علم ہے۔وہاں جیسا کسی سے سنا یا عمارت پر لکھا ہوا پایا، میں نے بیان کردیا ہے۔تحقیقی مزاج والے لوگ تاریخ کی کتابوں سے تفحص کرسکتے ہیں۔

مسلم بن عقیل کے مزار کے صحن کے ایک کونے میں ایک منبر رکھا تھا۔ہمارے کچھ ایرانی ساتھی جو عبا وعمامہ میں ملبوس تھے (جنہیں ایران میں ''حجۃ الاسلام'' کہا جاتا ہے، جیسے ہمارے ہاں جس نے بھی داڑھی رکھی ہو، اسے مولوی یا صوفی کہہ دیا جاتا ہے) اس منبر پر بیٹھ کر، تصویریں بنوا رہے تھے۔ہم پاکستانی اور ہندوستانی بھی ان کے ساتھ کھڑے ہوکر تصویریں بنواتے رہے۔جب تصویر کشی کا کام ختم ہوگیا تو ایک ایرانی نے خوش طبعی سے اپنے دوسرے ایرانی ساتھی سے کہا کہ اب آپ جب منبر پر بیٹھے ہی ہیں تو روضہ خوانی بھی کردیں۔دوسرے ایرانی نے بھی خوش مزاجی سے کہا: ''میں اتنا سستا روضہ خوان بھی نہیں ہوں۔میرا معاوضہ ایک ہزار ڈالر ہے۔'' اتفاق سے میری جیب میں ٹھیک ایک ہزار ڈالر موجود تھے، میں نے کہا: ''آغا! آپ روضہ پڑھ دیں، یہ رہے ایک ہزار ڈالر۔'' مولانا نے پھر خوش طبعی سے کہا کہ وہ کس قدر مستجاب الدعوات ہیں، اُدھر منہ سے ہزار ڈالر طلب کیے، اِدھر ہزار ڈالر پیش ہوئے۔

یہ زیارات کرتے کرتے، غروب آفتاب ہو چکا تھا۔کوفہ کی مسجد میں نماز مغربین کی صف بندی ہو رہی تھی۔ہم نے واپسی کی راہ لی اور عشا تک کربلا اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔

عتبہ عباسیہ اور عتبہ حسینہ کے عجائب گھر:۔ ۷ اکتوبر کو کانفرنس کے بچے کھچے شرکا کو عتبہ عباسیہ سے ملحق متحف الکفیل (کفیل میوزیم) دکھایا گیا اور بعد میں اسی میوزیم کے مخزن یعنی ریزرو روم لے جایا گیا۔میوزیم میں تو کوئی خاص کشش نہ تھی اور تھا بھی مختصر، لیکن مخزن نوادر سے بھرا پڑا تھا۔مخزن کے سربراہ استاد صادق لازم جاسم نے ہمارا استقبال کیا اور اس مخزن میں موجود لاتعداد اشیا میں سے محض چند خصوصی طور پر دکھائیں اور ان کے بارے میں بتایا۔اس مخزن میں نمایاں چیز قالین تلواریں اور خنجر تھے۔قالین بے شمار تھے اور سب کو چادروں سے ڈھانپ کر اور لپیٹ کر رکھا تھا۔یہ قالین پہلے ادوار میں یہاں استعمال ہوتے رہے ہیں یا عتبہ کی نذر کیے گئے ہیں۔یہ قالینوں کا ایک نایاب خزانہ تھا جس سے الگ میوزیم تشکیل دیا جاسکتا ہے (تہران میں ایسا ہی موزۂ فرش یعنی کارپٹ میوزیم موجود ہے) مخزن کی الماریاں اور درازیں ہر قسم کے نوادر سے بھری پڑی تھیں بندوقیں، مسکوکات، چراغ دان، سلطان عبدالحمید کا طغرا، ترکی کتبات، سماور، گھڑیاں، کرنسی نوٹ، اور بے شمار چیزیں۔

عتبہ حسینیہ کا متحف (عجائب گھر) قدرے بڑا اور بہتر حالت میں ہے۔وہاں داخل ہوتے ہی تصاویر کے ذریعے، صدام دور میں (۱۹۹۱ء) بعث حکومت کے خلاف شعبانیہ تحریک کے دوران دونوں روضوں پر ہونے والے حملات اور ان

کی تباہی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ایک مصنوعی سوختہ درخت بھی وہاں نصب کیا گیا ہے جس کے تنے میں سرخ روشنی ڈال کر جلنے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔اس متحف میں روضے کی ایک پوری پرانی ضریح (جالی) بھی رکھی ہے۔دل چسپ امر یہ ہے کہ متحف دیکھنے والے سیاح اس جالی میں بھی کرنسی نوٹ پھینک جاتے ہیں!اس عجائب گھر میں ایک نہایت دلکش ایرانی دست باف قالین تھا جس کے کناروں پر فارسی مدحیہ اشعار بُنت میں آ گئے ہیں۔یہ اور اس طرح کے کچھ اور قالین دیکھ کر ایرانیوں کی ہنرآفرینی کی داد دینا پڑتی ہے۔

ان دونوں عجائب گھروں نے ہمیں جو گائیڈ کیٹلاگ دیا ان کے مطابق عتبہ عباسیہ میں دو نادر قالین موجود ہیں،ان میں سے ایک پر رسول اللہ اور دوسرے پر حضرت علی کی شبیہ بُنی گئی ہے۔ان دونوں قالینوں کی تصویر کیٹلاگ میں موجود ہے۔عام طور پر تصاویر میں رسول اللہ کا چہرہ نہیں بنایا جاتا اور اس کی جگہ نور کا ایکہالہ بنا دیا جاتا ہے لیکن اس قالین پر چہرے سمیت پورے قد کی شبیہ بنائی گئی ہے۔حضرت علی کی تصویر تو ویسے ہی ایران میں عام ہے۔مجھے نہیں معلوم ان دونوں عجائب گھروں میں محفوظ نادر اشیا کا کوئی مفصل علمی نوعیت کا کیٹلاگ بنایا گیا ہے یا نہیں؟لیکن یہ عجائب گھر دیکھ کر یہ احساس ضرور ہوا کہ اگر ان میں محفوظ ہر چیز کی علمی فہرست تیار کی جائے تو اسلامی فنون کی تاریخ نویسی میں بہت مدد ملے۔

مطبعہ دارالکفیل:۔شام کو ہمیں کربلا شہر سے باہر مطبع دارالکفیل دکھایا گیا۔یہ مطبعہ،عتبہ عباسیہ کا ہے۔یہ ایک بہت وسیع عمارت ہے اور ایک وسیع ہال میں کتابوں کی طباعت،سلائی،جلد پر ٹھپہ لگانے اور جلد بندی کے الگ الگ پلانٹ کام کر رہے ہیں۔یوں سمجھیں کہ ایک سرے میں کوئی کتاب چھپنے کے لیے ڈالیں تو وہ دوسرے سرے سے مکمل جلد بند ہو کر نکل آتی ہے۔مطبعہ کے مدیر عام نے ہمیں مشینوں کے بارے میں بتایا کہ یہ سب جرمنی سے منگوا کر لگائی گئی ہیں۔عتبات کربلا اور حکومتی اداروں کے کام کے علاوہ یہاں نصابی کتب اور پوسٹر وغیرہ بھی طبع کیے جاتے ہیں۔مدیر صاحب نے ہمیں اپنے مطبعہ میں طبع شدہ **قرآن مجید** کا ایک نسخہ دکھایا اور عربی میں اس کی خصوصیات بتاتے ہوئے اسے ''شیعہ قرآن'' قرار دیا۔جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو میں نے اعتراضاً سوال کیا کہ آپ اسے شیعہ قرآن کیوں کہہ رہے ہیں؟انھوں نے اس کی توجیہ یہ کی کہ یہ ایک شیعی پریس میں،شیعی منتظمین کی طرف سے شیعہ زائرین میں تقسیم کرنے کے لیے چھاپا گیا ہے۔میں نے کہا یہ توجیہ قابل قبول نہیں ہے،اس سے یہ تاثر ملتا ہے گویا یہ کوئی دوسرا قرآن ہے (نعوذ باللہ)۔میرے اس اعتراض پر انھوں نے اپنا بیان واپس لے لیا۔میں نے اس قرآن مجید کا ہدیہ پوچھا تو انھوں کہا یہ آپ کو ہدیہ ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ قرآن مجید بہت نفاست سے چمکیلے کاغذ پر رنگین حاشیے کے ساتھ چھپا ہے اور اس پر قرائت بہت آسان ہے۔

کربلا میں آخری دن:۔۱۸ اکتوبر کو ہماری پرواز نجف سے سوا چار بجے بعد از ظہر تھی۔اس کے لیے ہمیں ایک بجے کربلا سے روانہ ہونا تھا۔سو،ہمارے پاس صبح کا وقت تھا۔یہ وقت گذارنے کے لیے ہم عتبہ عباسیہ کے کتب خانہ چلے گئے۔یہ جانا بے

سود نہ رہا۔ مجھے وہاں سے عتبہ عباسیہ کے عربی مخطوطات کی دو جلدوں میں فہرست مل گئی اور ڈاکٹر خان کو ایک مجلّہ سے کسی مقالے کی تصویر چاہیے تھی۔ انھوں نے اس کی تصویر بنوائی۔ عتبہ عباسیہ پر آخری حاضری دی اور وہاں سے رخصت ہوئے۔

میرے ہم سفر ڈاکٹر احمد خان:۔ مندرجہ بالا سطور میں کئی بار اپنے ہم سفر ڈاکٹر احمد خان کا ذکر آیا ہے۔ کہتے ہیں کسی کے بارے میں جاننا ہو تو اس کے ساتھ سفر کیا جائے۔ یہ کہاوت بالکل سچ ہے۔ ویسے تو میں ڈاکٹر صاحب کو شخصی اور علمی طور پر ۱۹۷۰ کی دہائی سے جانتا ہوں جب وہ ادارۂ تحقیقات اسلامی کے کتابدار تھے اور میں وہاں استفادہ کے لیے جاتا تھا، لیکن ان کے ساتھ مفصل نشست یا گفت گو کا موقع اسی سفر میں ملا۔ جب پہلے دن اسلام آباد ہوائی اڈے پر ان کے ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس دیکھا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سادگی سے سفر کرنے کے قائل ہیں اور بارِ سفر سے سفر کا لطف غارت نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی عمر ۸۱ سال بتائی۔ اس کے باجود وہ بے حد چاق و چوبند ہیں۔ جسم بھی چھریرا ہے۔ میں نے اس تن درستی کا راز پوچھا تو کہنے لگے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا! چنانچہ اس سفر میں معلوم ہوا کہ میں ابھی سویا ہوتا اور ڈاکٹر صاحب، روزانہ صبح بوقت فجر سیر کو نکل جاتے اور ایک گھنٹہ بعد آتے۔ شام کے کھانے کے بعد بھی چہل قدمی کرتے جس میں میں بھی شریک ہوتا۔ یہی ان کی صحت کا راز تھا۔ انھوں نے ایک حدیث نبوی بیان کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ بے شک تھوڑا کام کرو لیکن اس میں باقاعدگی رکھو۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب بھی ہر حالت میں اپنی صبح اور شام کی سیر کا ناغہ نہیں کرتے۔ میرا خیال تھا تمام مخطوطہ شناسوں اور عالموں کی طرح ڈاکٹر صاحب بھی خشک مزاج ہوں گے، لیکن ایسا نہ تھا اور وہ وقتاً فوقتاً چٹکلے چھوڑتے رہتے۔ شروع کے تین چار دن انھوں نے ایک ہی لباس، جو سفید رنگ کا تھا، پہنے رکھا۔ میں بھی ان کا بریف کیس دیکھ کر یہی اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ اپنے ساتھ ایک ہی جوڑا لائے ہیں اور آخر تک یہی استعمال کریں گے۔ پانچویں دن کہنے لگے آج میں اپنی کینچلی بدل نہ لوں؟ اور اپنے بریف کیس سے آسمانی رنگ کا جوڑا نکال کر پہنا۔ ڈاکٹر صاحب کا اور میرا آبائی علاقہ تقریباً ساتھ ساتھ ہی ہے۔ ان کے والد مونگ سے اُٹھ کر منڈی بہاالدین آ گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا بچپن منڈی بہاء الدین میں گذرا ہے۔ میرا گاوں ساہن پال شریف، منڈی بہاء الدین سے کوئی پچیس کلو میٹر دور ہے۔ ہم دونوں کی پنجابی کا لہجہ ایک ہی ہے، چنانچہ ہم اپنے علاقے کی ٹھیٹھ پنجابی بولتے رہے اور ہمیں ایک دوسرے کے الفاظ سمجھنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ اس علاقے کے لہجے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہائے ثقیل (دوچشمی ہا والے الفاظ) کو مزید ثقیل کر کے بولا جاتا ہے۔ ہم اس کو بھاری بولی کہتے ہیں۔ چنانچہ تفنن طبع کے لیے میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: ''بھکھی کا ایک بندہ کہتا تھا: بھنڈیاں ڈھڈ وچ بھنڈ گھتیا اے'' اس میں ہائے ثقیل کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ عربی کے عالم ہیں، کانفرنس کے شرکا اور کربلا، نجف کے گلی کوچوں میں سب سے بلاتکلف عربی بول لیتے۔ وہ اپنا وقت ضایع نہیں کرتے تھے۔ ہوٹل کی لابی سے ایک عربی کتاب اٹھا لائے جس میں عراق میں واقع

مقامات مقدسہ کا ذکر تھا اور ان کی زیارت کے آداب درج تھے۔ کتاب کوئی علمی نہ تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ زائرین کے لیے لکھی گئی ہے اور اس میں جعلی روایات کا سہارا لیا گیا ہے۔ مثلاً اس میں لکھا تھا کہ جب کوئی زائر کربلا میں عتبہ حسینیہ کی زیارت کے لیے آئے تو تین دن پہلے سے روزہ رکھے اور اپنی حالت غمگین بنا کر آئے اور یہاں آ کر اچھے کھانے نہ کھائے وغیرہ وغیرہ۔ ہم ان جعلی روایتوں کو سامنے رکھ کر، ہوٹل میں بوفے کی میز پر ایک دوسرے کو ٹوکتے کہ ہم آداب زیارت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں! غالباً ہمارے میزبان بھی ان روایتوں سے بے خبر تھے جنھوں نے ہوٹل کے رستوران میں انواع واقسام کے کھانوں کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی علمی معلومات کی تکمیل کا بھی خیال رہتا۔ پہلی دفعہ جب ہم عتبہ عباسیہ کے کتب خانے گئے تو وہاں ایک رسالے میں اپنے مطلب کا مضمون دیکھا۔ قیام کے سب دنوں میں وہ مجھ سے اس مضمون کے حصول کی خواہش کا اظہار کرتے رہے۔ بالآخر، آخری دن وہاں جا کر اس کا عکس بنوا کر ہی دَم لیا۔ میں جب سفر پر نکلتا ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ واپسی پر بہت سی کتابیں بھی سامانِ سفر میں شامل ہو جائیں گی۔ چنانچہ اپنے ساتھ ایک اضافی تھیلا رکھتا ہوں تا کہ واپسی پر کام میں لایا جا سکے۔ میں اس سفر میں اپنے ساتھ دو اضافی تھیلے لے گیا تھا اور سفر میں جمع ہونے والی کتابیں بسہولت ان میں سما گئیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ایسا بندوبست کر کے نہیں گئے تھے۔ اب جب کتابیں جمع ہو گئیں تو متفکر ہوئے۔ میں نے مشورہ دیا کہ بازار سے ایک بیگ خرید لیں اور کتابیں اس میں ڈال لیں۔ کہنے لگے نہیں، یہیں ہوٹل سے کوئی کارٹن مل جائے گا اس میں ڈال کر لے جاؤں گا۔ کارٹن تو نہ ملا، پھر انھیں یہ سوجھی کہ کسی پلاسٹک کے تھیلے میں کتابیں ڈال کر اوپر سے رسّی سے باندھ کر لے جائیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں آخری دن رسّی کی تلاش میں نکلے۔ اسی دکان پر بیگ بھی تھا اس کی قیمت تین ہزار دینار تھی، لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایک ہزار دینار کی رسّی خرید لی اور ہوٹل آ کر بہت مہارت سے پلاسٹک کے تھیلے میں کتابیں باندھ لیں۔ اسے دیکھ کر میں نے کہا آپ نے مولوی شمس الدین تاجر کتب نادرہ (لاہور) کی یاد تازہ کر دی۔ اُن کے بارے میں کہیں پڑھا ہے کہ وہ ایسی خوبصورتی سے کتابیں باندھتے تھے کہ گرہیں کھولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب ہم واپسی پرواز کے لیے نجف ہوائی اڈے پہنچے تو پہلے سیکورٹی والوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے بتایا: کتابیں ہیں، کہنے لگے دکھاؤ، چنانچہ پلاسٹک کا ایک کونہ پھاڑ کر انھیں یقین دلایا گیا کہ کتابیں ہی ہیں۔ اب قطر ائرویز والے پھٹا ہوا پیکٹ لینے کے لیے تیار نہ تھے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ۴۰۰۰ ہزار دینار دے کر اس پر ریپر چڑھوایا۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے کل ۵۰۰۰ دینار صرف کیے، جب کہ بیگ ۳۰۰۰ دینار میں مل رہا تھا اور آیندہ سفر میں بھی کام آتا!

سفر کے علمی تحایف:۔ اس سفر میں کچھ کتابیں جمع ہو گئیں جو سب کی سب تحفے میں ملی تھیں۔ کچھ رسائل اور تبلیغی نوعیت کی کتابیں، بارِ سفر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ہوٹل میں ہی چھوڑنا پڑیں۔ جو کتابیں میں اپنے ساتھ لایا، وہ یہ ہیں:

۱.مکتبہ و دار مخطوطاتِ عتبہ عباسیہ اور کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے حسب ذیل کتب دی گئیں۔**المصحف الشریف المنسوب الی علی بن ھلال البغدادی المعروف بابن البوّاب**،عباسی دور کے خطاط سے منسوب قرآن کریم کے جز اول کی عکسی اشاعت مع تحقیق رسم الخط وغیرہ از علی الصفار،ابن بواب سے منسوب یہ نسخہ (اصل) عتبہ عباسیہ کے دار مخطوطات میں موجود ہے۔طبع شدہ نسخہ کے اندر اور اس کی جلد کی پشت پر جلی خط میں **یا قمر بنی ھاشم** کا طغرا چھاپا گیا ہے ۔ڈاکٹر احمد خان نے یہ دیکھ کر کہا اب تک قرآن مجید کی جلد پر عام طور پر آیت لایمسہ الاّ مطھرون چھاپی جاتی ہے،قرآن مجید میں کسی شخص کا نام چھاپا جانا پہلی دفعہ دیکھا ہے؛**فہرست مخطوطات مکتبۃ العتبۃ العباسیۃ المقدسہ** (دو جلدیں)؛**فہرس مخطوطات مکتبۃ الامام الخوئی فی النجف الاشرف** (پہلی جلد)؛**وشائح السّراء فی شأن سامراء**[ارجوزۃ فی تاریخ سامراء].

۲.دارالتراث ،نجف اشرف کے طرف سے:**فہرس مخطوطات مکتبۃ کاشف الغطاء العامہ**؛ **فہرس المخطوطات المصورۃ فی مکتبۃ الامام الحکیم العامۃ** (دو جلدیں)؛**وثائق نجد**؛

احمد علی صاحب کیپر سالار جنگ میوزیم حیدرآباد نے **القرآن الکریم الفی** دیا، یہ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ایک قلمی قرآن کریم کی عکسی اشاعت ہے۔ہر پارہ دو صفحوں پر ختم ہوجاتا ہے اور ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے۔انگریزی کتاب The Salar Jungs of Hyderabad بھی عنایت کی۔یہ خود احمد علی صاحب کی تصنیف ہے اور چمکیلے کاغذ پر تاریخی تصاویر کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔یہ حیدرآباد دکن کے سالار جنگوں کا تذکرہ ہے۔

ڈاکٹر حمید مجید ھدّو[ولادت ۱۹۴۱ء] جو عراق کے معاصر مورّخ ہیں اور آج کل بغداد میں رہتے ہیں۔ان سے کانفرنس میں ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنی مرتّبہ کتاب **تذکرۃ الاولیاء** تصنیف مرتضی نظمی زادہ بغدادی (اٹھارہویں صدی) اپنے دستخط کے ساتھ عنایت کی اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ انھوں نے بہت پہلے علامہ اقبال پر ایک عربی کتاب **اقبال:الشاعر والفیلسوف والانسان** لکھی تھی اور آج کل قرآنی علوم پر ایک عربی رسالہ **المصباح** کے مدیر ہیں۔**تذکرۃ الاولیاء** کا موضوع بغداد اور قرب و جوار میں مدفون ائمہ،صوفیہ اور زہاد کا تذکرہ ہے۔

مطبع الکفیل ،کربلا میں طبع شدہ **القرآن الکریم** کا ایک نفیس رنگین طباعت والا نسخہ جو وہاں کے مدیر نے میری درخواست پر مجھے دیا۔اس کی جلد بھی بہت عمدہ اور نرم ہے۔یہ دو سائزوں میں چھپا ہے ۔ایک رحلی اور دوسرا کتابی سائز۔میں نے رحلی سائز لیا۔

شیخ محمود الصافی نے **ضیاء المفازات الی طرق الاجازات** تالیف علامہ شیخ آقا بزرگ طہرانی عنایت کی۔

عمومی تاثرات:۔کربلا اور نجف دونوں پسماندہ علاقے ہیں۔شہر میں سڑک کے کنارے تجاوزات بہت تھیں۔ہم کربلا میں جس علاقے میں رہتے تھے،وہاں پرانی طرز کے مکانات تھے۔کوئی اونچی عمارت نہ تھی۔اونچی عمارتیں صرف ہوٹلوں کی

تھیں۔ جب ہم نجف گئے اور واپس آئے تو ہماری گاڑی کربلا کی ایک ایسی سڑک سے گذری جہاں کچھ جدید عمارتیں اور دکانیں تھیں، ورنہ شہر کا عمومی تاثر ایک پسماندہ، قدیم شہر کا ہے۔ ایسا سمجھ لیں جیسے پنجاب میں جی ٹی روڈ پر واقع ہمارے شہر گجرات، گوجرانوالا وغیرہ۔

کربلا اور نجف میں، اب بھی لکڑی کی ریڑھی سامان اور سواریاں ڈھونے کا کام دیتی ہے اور انسان ہی کھینچتے ہیں۔ کربلا میں شہر کی فضا پر گرد و غبار چھایا رہتا ہے۔ حرم کے اطراف کے بازاروں میں زائرین خریداروں کا رش تھا لیکن یہ دکانیں معمولی سامان کی تھیں، کپڑے، ملبوسات، مٹھائیاں، کھلونے اور کھانے۔ جیسا کہ دنیا میں ہر جگہ ہوتا ہے کہ مقامات مقدسہ یا مزارات سے ملحق بازاروں میں مذہبی مصنوعات بھی بیچی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی عتبات کے آس پاس خاک کربلا، حسینی اور عباسی پرچم، تسبیحات اور مذہبی عبارتوں والے دیگر پارچہ جات بکثرت بک رہے تھے۔ زائرین کے لیے ٹھنڈے پانی کی سبیلیں جگہ جگہ نصب ہیں۔ نجف اور کربلا کے چھوٹے محلوں میں بجلی کی ترسیل کا نظام بہت ہی خطرناک ہے۔ بلا مبالغہ سینکڑوں تاریں گھتم گھتا ہیں اور ایک کھمبے سے دوسرے اور تیسرے تک جاتی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر عراق کے محکمۂ بجلی پر سخت حیرانی ہوئی کہ کس طرح کھلے عام سینکڑوں تاروں سے بجلی گذار کر انتقالِ برق کیا جاتا ہے۔ ان میں کوئی ایک تار بھی ننگی ہو جائے یا اس کو آگ لگ جائے تو کیا نتیجہ ہوگا؟ اب تو دنیا میں زیر زمین نظام ترویج پا رہا ہے لیکن عراقی انجینئر بجلی کی تاروں سے فضا میں کمندیں ڈال رہے ہیں! کربلا اور نجف میں جگہ جگہ سیکورٹی چیکنگ تھی۔ ہمارے ہوٹل ارض النور سے حرم تک دو دفعہ چیکنگ ہوتی، حالانکہ یہ سو دو گز کا ہی فاصلہ تھا۔ یہاں ہر مزار تک رسائی کے لیے سیکورٹی کے عمل سے گذرنا پڑتا ہے۔ یہی حال نجف-کربلا ہائی وے پر تھا۔

دونوں عتبات، زائرین سے اَٹے پڑے تھے۔ زیادہ تعداد ایرانی زائرین کی نظر آتی ہے۔ ایرانی زائرین میں بھی زیادہ تعداد خواتین کی ہے، جو سب سیاہ چادروں میں لپٹی ہوتی ہیں۔ رات کے وقت ہم عتبات کی طرف جاتے تو بین الحرمین راستے، برآمدے اور برآمدے کے باہر سڑک کے کچھ حصے پر زائرین قالین، چادریں بچھائے لیٹے نظر آتے، کھانا کھا رہے ہوتے۔ بچے اِدھر اُدھر اچھل کود رہے ہوتے۔ نوجوان سیلفیاں بنا رہے ہوتے۔ گویا ایک تفریح اور پکنک کا ماحول ہوتا۔ خوب گہما گہمی اور رونق ہوتی۔ بین الحرمین طویل راستے پر ہم نے کچھ ایرانیوں اور پاکستانیوں کی منڈلی کو دائرے میں ماتم کرتے بھی دیکھا۔ راہ گیر لوگ ماتم زنی کا منظر دیکھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ اکثر زائرین کو دیکھا کہ وہ حرم کے ہر دروازے کو چومتے ہوئے اندر داخل ہوتے۔ جب ضریح تک پہنچتے تو اسے بھی چومتے اور اپنی کمر اس کے ساتھ رگڑتے۔ بعض لوگ ضریح کے باہر نصب دروازے سے داخل ہوتے وقت سجدہ ریز ہوتے۔ ضریح سنہری ہے، لیکن زائرین کے ہاتھ جہاں تک پہنچتے ہیں اس حصے سے سنہری پان اتر چکی ہے اور وہ نقرئی معلوم ہوتی ہے۔ اسی ضریح سے

زائرین اندر کرنسی نوٹ بھی پھینکتے ہیں۔نوٹوں کے اس انبار میں مختلف ملکوں کی کرنسیاں نظر آتی ہیں۔اگر سال بھر کی نذور وفتوح کی مالیت کا اندازہ لگایا جائے تو یہ لاکھوں کروڑں میں ہوگی۔کچھ زائرین کو سرخ اور سبز چادریں ضریح کی چھت پر پھینکتے ہوئے بھی دیکھا۔وہاں ایسی چادروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔یہ منت ماننے کا کوئی طریقہ تھا۔ان مزارات حاضری کے وقت شیعہ زائرین مخصوص دعاے زیارت پڑھتے ہیں۔قرآن خوانی نہیں کرتے۔عتبہ عباسیہ کے اندر یہ دعا ایک بلند تختے پر لکھی ہے۔زائرین اس کے آگے کھڑے ہوکر دعا پڑھتے ہیں اور پھر مزار تک جاتے ہیں۔ضریح کے آس پاس الماریوں میں بھی زیارت کے کتابچے بکثرت دستیاب ہیں۔کچھ لوگ ضریح کے آس پاس اور صحن میں نماز بھی پڑھ رہے ہوتے ۔جس طرح حرم بیت اللہ اور مسجد نبوی میں میتیں ،نماز جنازہ کے لیے لائی جاتی ہیں،اسی طرح یہاں بھی میتیں ،نماز جنازہ کے لیے لائی جاتی ہیں۔یہ منظر میں نے عتبہ علویہ،عتبہ عباسیہ اور عتبہ حسینیہ پر بارہا دیکھا۔عتبہ علویہ میں چونکہ عام گاڑیاں ،عتبہ کے دروازے تک نہیں جاسکتیں،انتظامیہ نے سڑک سے دروازے تک سیاہ رنگ کی مخصوص میّت گاڑیاں چلا رکھی ہیں جس میں میّت کو رکھ کر اندر روضے تک لایا جاتا ہے۔بصرہ کی کھجوریں ہم نے بچپن سے سنی ہوئی تھیں۔بصرہ عراق میں ہی ہے۔کربلا اور نجف کے اطراف میں کھجوروں کے باغات بھی دیکھ چکے تھے۔ارادہ ہوا کہ گھر والوں کے لیے یہاں سے کھجوریں سوغات لے جاتے ہیں۔منتظمین نے ایک عراقی نوجوان ہمارے ساتھ بھیجا اور ہم عتبات کے آس پاس کے بازاروں میں کھجوریں تلاش کرتے رہے۔صرف ایک جگہ کھجوروں کا ٹھیلا نظر آیا لیکن وہ کھجوریں عمدہ نہ تھیں۔کھجوروں کی تلاش میں ہم سبزی اور پھل منڈی تک جا پہنچے۔وہاں عمدہ انار،تربوز اور مالٹے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے لیکن کھجوریں بہت معمولی درجہ کی تھیں۔ہمارے ساتھ جو عراقی نوجوان تھا اس نے کہا یہاں تلاش بے کار ہے،وہ کربلا کے اطراف سے بہت عمدہ کھجوریں ہمیں جانے سے پہلے لا دے گا۔ہم نے اس کی بات کا اعتبار کیا اور کھجوروں کی تلاش ترک کردی۔لیکن اگلے روز وہ نوجوان ہماری روانگی تک نہ آیا۔اس کی بدعہدی پر بہت افسوس ہوا۔میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اس سفر کا مجھے گھر بیٹھے بٹھائے موقع مل گیا۔خدا نے کانفرنس کو حیلہ اور عیسی کریمی کو وسیلہ بنایا۔لطف کی بات یہ ہے کانفرنس میں مجھے کوئی مقالہ نہیں پڑھنا تھا اور عیسی کریمی صاحب کی کرم فرمائی کے لیے یہی کہہ سکتا ہوں:''حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی''۔میرا حاصلِ سفر،نجف اور کربلا میں اسلامی تاریخ کے کچھ اہم مقامات کی زیارت سے مشرف ہونا ہے۔مجھے معلوم ہے ہمارے بہت سے بھائی بند،زندگی بھر ان جگہوں کی زیارت کی آرزو کرتے رہتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ ہی خوش نصیبوں کی تمنا پوری ہوتی ہے،باقی دل میں حسرت لیے دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔میں تو اپنے لیے یہی سمجھتا ہوں:

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نبخشد خدائے بخشندہ

☆☆☆

زہرہ خاتون (ڈاکٹر)
شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات کا ایک مختصر جائزہ

شمال میں ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیوں سے لے کر بحر ہند کی بیکراں امواج سے ہم آغوش جنوبی سواحل تک اور مشرق ومغرب کے آفاق کو جوڑنے والی بے پایاں سرزمین ہندوستان قدیم ترین اقوام کے جنگ وجدال کی رزم گاہ اور قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے۔لیکن یہ تہذیبیں جابجا کسی گوشے میں نمودار ہوئیں اور اپنے باقیات وعلامات کو تاریخ کے حوالے کر کے عہد گزشتہ کی دبیز تاریکیوں میں گم ہوگئیں۔اسی سرزمین پر نووارد اور پہلے سے موجود اقوام کے درمیان جنگ وجدال، فتح وشکست وعروج وزوال کی تاریخ رقم ہوتی رہی۔یہ سلسلہ ان گنت صدیوں اور قرنوں تک جاری رہا لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جس نے تاریخ کے ان تاریک ادوار کو ایک نورانی صبح سے روشناس کرایا اور وہ اسلام اور اہلِ اسلام کا ورود تھا جو اسلام کی مشعل نورانی لے کر جوق در جوق، فوج در فوج چلے آرہے تھے اور اس قدیم سرزمین پر اپنے دوام کو ثبت کرتے جارہے تھے۔ان میں افواج، فاتحین اور شاہان ذوالجلال سب شامل تھے۔

لیکن ان سب سے الگ مگر ان کے متوازی ایک خاص فاصلہ رکھتے ہوئے بزرگوں کے وہ قافلے بھی منزلوں پر منزلیں طے کررہے تھے جو دلوں کی تسخیر کی مہم پر چل پڑے تھے ان میں شیوخ، عظام اور صوفیائے کرام شامل تھے۔ وہ تاریک بستیوں میں بسنے والوں کو ایک نئے روشن نظام کی تابانی سے روشناس کرانے کی مہم پر نکل پڑے تھے۔خدمتِ خلق، تہذیب اخلاق، انسان دوستی، امن وآشتی کا درس دے رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی عملی مثال بھی پیش کررہے تھے۔ان کی یہ روش عوام اور خواص کو گرویدہ کرنے لگی اور خلق ان کے گرد اکٹھا ہونے لگی۔ان بزرگوں کو نہ جنگ وجدال سے اور نا ہی بادشاہوں کے جاہ وجلال سے کچھ لینا دینا تھا۔وہ لوگوں کے درمیان بیٹھ کر ان کو انسان دوستی کا درس دے کر انھیں پرسکون زندگی اور روحانی مسرتوں کی راہ دکھارہے تھے جابجا ان کے جمگھٹے اور خانقاہیں مرکز خلائق بنتے گئے۔رفتہ رفتہ انہی بزرگوں کے پند ونصائح اور مواعظ کے اجزا اکٹھا ہوکر نقش دوام کی صورت میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے گئے، اور جنھیں بعد میں ملفوظات کا نام دیا گیا۔برصغیر ہندوپاک کی تاریخ میں مرتبہ ملفوظات میں انیس الارواح کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ جبکہ مولانا جلال الدین کی تقریریں نیز ارشادات کا مجموعہ ''فیہ مافیہ'' اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی ہے۔(۱)

اگرچہ اس سے پہلے خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کی امالی بھی قابلِ ذکر ہے۔لیکن ہم اسے ملفوظات کے اصطلاحی

معنوں میں شمار نہیں کر سکتے اس کی متعدد وجوہات تھیں اور شاید انھیں وجوہات کی بناء پر کتاب امالی ہروی کی جگہ طبقات الصوفیہ کے نام سے زیادہ معروف ہوئی۔

انیس الارواح کے بعد کئی اور مجموعے سامنے آئے جیسے ''دلیل العارفین'' (ملفوظات حضرت خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز) جسے آپ کے مرید خاص حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے مرتب فرمایا، یہ بارہ مجالس پر مشتمل ہے۔ اسی طرح فوائد السالکین (ملفوظات حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ) مرتبہ حضرت مسعود اجودھنی معروف بہ بابا فریدالدین گنج شکر، راحت القلوب (ملفوظات زبدۃ الاولیاء، حضرت بابا فریدالدین گنج شکر) مرتبہ حضرت نظام الاولیا محبوب الٰہی، اسرار الاولیا (شیخ فرید گنج شکر کے ملفوظات کا دوسرا مجموعہ) مرتبہ خواجہ بدر اسحاق اور فوائد الفواد (ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء) مرتبہ خواجہ حسن سنجری وغیرہ۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی جو ہر تصوف موسوم بہ 'انفاس عیسیٰ' کے نام سے معروف ہے۔ یہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات کا وہ مجموعہ ہے جسے انہی کے خلیفہ ارشد حضرت قاری سید محمد عیسیٰ الہ آبادی نے مرتب کر کے کتابی شکل عطا کی۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی پیدائش ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو ہوئی۔ آپ کے آباء واجداد نے کئی صدیوں پہلے تھانیسر ضلع کرنال سے نقل سکونت کر کے تھانہ بھون میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ شہر آگرہ کے نوح میں واقع یہ چھوٹا سا قصبہ اپنی مردم خیزی میں مشہور تھا، یہاں کے مسلمان شرفاء اہل شوکت وقوت اور صاحب فضل وکمال رہے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے والد شیخ عبدالحق ایک مقتدر رئیس صاحب نقد وجائیداد اور ایک کشادہ دست انسان تھے۔ فارسی میں اعلیٰ استعداد کے مالک اور بہت اچھے انشاء پرداز تھے۔ آپ نے بڑے ہی مشفقانہ انداز سے مولانا کی پرورش کی۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ بچپن سے ہی مولانا کا مزاج دینی تھا۔ مولانا تھانوی کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔ حافظ حسین مرحوم دہلوی سے کلام پاک حفظ کیا۔ تھانہ بھون جا کر حافظ مولانا فتح محمد سے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۹۵ ہجری میں دیوبند آ کر پانچ سال تک تعلیم میں مشغول رہے۔ ۱۳۰۱ ہجری میں جب آپ ۲۱ سال کے ہوئے تو اپنے استاد مولانا محمد یعقوب قدس سرہٗ کی خدمت میں جا بیٹھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد کانپور آئے اور مدرسہ فیض عام میں تدریس شروع کر دی۔ ۱۳۱۵ھ میں دوبارہ اپنے آبائی وطن واپس آ گئے اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خانقاہ کو نئے سرے سے آباد کیا۔ اور مدرسہ اشرفیہ کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی جہاں آخری دم تک تزکیۂ نفس اور اصلاحِ معاشرہ جیسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد تقریباً ۸۰۰ ہے۔ جن میں اہم ترین تفسیر بیان القرآن، اعمال قرآنی، حقیقۃ الطریقہ، سلوک وتصوف کے مسائل وروایات پر کتاب احیاء السنن، فقہی ترتیب کے مطابق مجموعہ احادیث امداد الفتوی، فقہی مسائل اور مباحث کا نادر مجموعہ الانتباہات المفیدہ، بہشتی زیور، المصالح العقلیہ وجمال القرآن وغیرہ۔ آپ کی تاریخ وفات ۱۳۶۲ھ ہجری ہے۔

آپ کی ملاقات حضرت شاہ محمد عیسیٰ سے شہر الہ آباد میں متعدد وعظ کے دوران ہوئی۔ اسی درمیان حضرت عیسیٰ کو مولانا اشرف علی سے ایک غائبانہ سی عقیدت کا احساس ہوا اور پھر ملاقات و گفتگو کے مواقع جو ملے تو ظاہری بات ہے کہ توفیق الٰہی نے دل کا دامن کھینچا۔ چنانچہ تھانہ بھون جا کر بیعت ہوئے اور سلسلہ چشتیہ صابریہ کے ذکر و شغل میں مصروف ہوئے۔ انہی دنوں اسٹیشن ماسٹری کی نوکری بھی مل گئی مگر اس کے باوجود وقت نکال کر وہیں مدرسہ ظہور الاسلامیہ میں مولانا نور محمد سے فقہ، حدیث و تفسیر کا باقاعدہ درس لیا، کچھ عرصہ بعد آپ لکھنؤ جوبلی اسکول میں عربی و فارسی کے استاد ہو گئے۔ وہیں آپ کی ملاقات مولوی عبدالباری صاحب فرنگی محلی سے ہوئی اور ان کے ہمراہ حج کے سفر پر بھی گئے۔

مکہ معظّمہ سے واپسی پر لکھنؤ سے مرزا پور، الہ آباد ہوتے ہوئے فیض آباد آ گئے یہاں آ کر تقریباً ۴۵ سال کی عمر میں حفظ قرآن کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ کچھ ہی مدت میں حافظ بھی کر لیا۔ ۱۹۲۳ء میں پھر الہ آباد واپس آ گئے اور اپنے مرشد کے حکم سے وہیں مقیم ہو گئے تاکہ سکون اور یکسوئی کے ساتھ طالبین کی تربیت و تعلیم فرمائیں۔ ۱۹۳۹ء میں رفیقۂ حیات کی وفات ہو گئی۔ ۴۰ء میں حضرت پر فالج کا اثر ہو گیا۔ علاج سے وقتی افاقہ ضرور ہوا لیکن بعد میں وہی آپ کی وفات کا سبب ہوا۔ اپنے مرشد کے وصال کے صرف ۸ ماہ بعد ہی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء میں ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی مسجد اٹالہ کے قریب ایک چھوٹی مسجد میں دفن ہوئے۔ (۲) سید شاہ محمد عیسیٰ زہد و تقویٰ میں اپنے تمام ساتھیوں میں نہایت ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حکیم الامت مولانا تھانوی نے سب سے زیادہ تعداد میں طالبین حق آپ ہی کے سپرد کیے۔ آپ کی اہم ترین تصانیف خلاصۃ البیان (تفسیر) ازالۃ الوس (حدیث) بہشتی ثمر دو حصہ (فقہ)، انفاس دو حصہ و کمالات اشرفیہ دو حصہ (تصوف)۔

مذکورہ ملفوظات کے بارے میں حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں کہ یہ مولانا محمد اشرف علی صاحب کے آخری دس پندرہ سالوں کے مطبوعہ مواعظ و تربیت سالک کے بیش قیمت جواہرات سے اختصار کے ساتھ اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کو یکجا کرنے کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ جو لوگ اس فن سے واقف ہیں اور مزید اضافہ کے خواستگار ہیں وہ تصوف کے تمام ضروری علوم و مسائل سے واقفیت حاصل کر لیں مقدمہ میں کہتے ہیں:

> ''جو سالکین امور غیر اختیاریہ کے حصول میں حیران و پریشان ہو کر مایوس ہو گئے ہوں اور ترک رذائل کی حقیقت و ماہیئت نہ جاننے کی وجہ سے اس راہ کو بہت ہی مشکل اور دشوار گزار سمجھنے لگے ہوں ان کے لیے یہ رسالہ مشعلِ راہ کا کام دے گا اور ان کے ادراک کو تقویت دے کر ان کے تعطل کا ازالہ کرے گا۔ نیز اخلاق رذیلہ کا ازالہ و تعدیل کر کے اخلاقِ حمیدہ کی تحصیل و تکمیل کا رہبر ثابت ہوگا۔'' (۳)

موصوف نے بہت سے منتشر نسخوں میں سے ایسے مجرب نسخوں کو یکجا کیا جس سے قارئین اس راہ کے مقصود وغیر مقصود اختیاری وغیر اختیاری امور کو اچھی طرح جان لیں، کتاب کے حجم کا بھی خیال رہے اور پڑھنے میں زیادہ دقت بھی نہ ہو۔ اس طرح مؤلف نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا۔

پہلا باب تعلیمات سے متعلق ہے جس میں تصوف کے مبادیات یعنی ضروری علوم و مسائل موضوع بحث ہیں جو کہ بصیرت فی المقصود میں بے حد مفید ہیں۔ دوسرا باب تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یعنی امور غیر اختیاریہ کی تحقیقات اور ان کے عجیب وغریب معالجات۔ باب سوم تہذیبات پر ہے جس کے دو حصے ہیں، اول متضمن ہے اخلاق کے ازالہ وتعدیل کے طریق کو اور حصہ دوم اخلاق حمیدہ کی تحصیل وتکمیل کی راہ کے بارے میں۔ چوتھا اور آخری باب ارشادات کا ہے۔ جس میں ان علوم و مسائل متفرقہ کا بیان ہے جو یک گونہ فن سلوک وتصوف میں مزید بصیرت پیدا کر سکتے ہیں۔

باب اول جو مسائل سے متعلق ہے اور جن کی مدد سے اہل طریقت، بصیرت کامل حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں ذیلی موضوعات روح سلوک، مجاہدہ کی حقیقت، مجاہدہ اختیاریہ واضطراریہ کا درمیانی فرق نیز ضرورت، اس کی قسمیں حقیقیہ و حکمیہ وغیرہ۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ تصوف کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہی نماز، روزہ تصوف ہے اور یہی اعمال مقصود ہیں۔ مجاہد کی ضرورت صرف نماز، روزہ کو نماز روزہ بنانے کے لیے ہے، یعنی تصوف کا خلاصہ صرف علم مع العمل ہے۔ اسی باب کے ذیلی موضوعات میں اہم ترین: آداب شیخ ومریدی، ضرورت بیعت، سماع موتی ودعای موتی وتوسل بموتی، فوائد صحبت شیخ، مجاہدہ کا مقصود، مختلف قسم کی دعائیں، مراقبہ وغیرہ۔ اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ صوفیہ حضرات کا فہم سب سے بڑھا ہوا ہے، چونکہ حضرات صوفیہ صاحب تقویٰ بھی ہیں اور صاحب وہب بھی۔ ساتھ ہی بتاتے ہیں کہ تصوف میں سینہ بہ سینہ ایک چیز ہے یعنی نسبت اور مناسبت اور مہارت، جو استاد کے پاس رہنے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ محض کتاب پڑھ لینے یا زبانی طریقہ دریافت کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی اور یہ وہ چیز ہے جو ہر علم میں سینہ بہ سینہ ہی ہے۔ خواہ بڑھئی یا باورچی کا ہی پیشہ کیوں نہ ہو، پھر یہ تو تصوف ہے جس میں برکت مشاہدہ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اصلاح نفس کے طریقوں پر بھی جا بجا روشنی ڈالی ہے۔

باب دوم تحقیقات کے عنوان سے ہے اس باب میں سہل ومجرب علاج ان غیر اختیاری امور کے بیان کیے ہیں جن میں سالکین اکثر وبیشتر مبتلا ہو کر سخت حیران وپریشان ہو جاتے ہیں جیسے کہ مختلف قسم کے وسوسے اور ان کا علاج، سالک کی پریشانیاں وغیرہ۔

تیسرا باب تہذیبات کے عنوان سے ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول اخلاق رذیلہ کے ازالہ تعدیل کے طریق پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصے میں اخلاق حمیدہ کی تحصیل وتکمیل کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔

صوفی نہ شود صافی تا درنکشد جامی
بسیار سفر باید تاپختہ شود خامی

صوفی کو چاہیے کہ ایک ایک کر کے تمام رذائل کی اصلاح شیخ سے ضرور کرائے اور طریقہ یہ اختیار کرے کہ جب ایک رذیلہ کی مقاومت پر پورا عبور اور قدرت حاصل ہو جائے اور وہ مادہ بالکل ختم ہو جائے تو دوسرے رذیلہ کا علاج شروع کرے کیونکہ رذائل کا پایا جانا تو ایک فطری عمل ہے۔

اندرین رہ می تراش و می خراش
تادم آخرد می فارغ مباش

مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کی کسی بات پر غصہ آتا ہے اور محققین کا کہنا ہے کہ غصہ وغضب کبر سے پیدا ہوتا ہے تو اس قسم کی تمام خامیوں یا کمیوں کا اگر علاج ہے تو وہ صبر اور تحمل وتامل ہے اور اسی طرح اگر اپنے باطن واعمال کی اصلاح انسان چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے نفسانی جذبات کی مخالفت کرے۔

اس باب کے حصہ اول کے ذیلی موضوعات میں مقامات سلوک کی تعریف غیبت پر قدرت، اس کے تدارک کا طریقہ، بدگمانی وتجسس کی صورتیں، کبر وخودرائی، مزح ومدح، ریا ووسوسہ، جوش وغضب، حقد وکینہ، دنیاے مذموم، حب و جاہ، حرص وطعام، کثرت کلام، اسراف وبخل، حیات وخجالت وغیرہ۔ اسی طرح حصہ دوم کے موضوعات: توبہ، عشق وتعلق مع اللہ، خوف ورجا، صبر، شکر، تفویض وتوکل، رضاء بالقضا، صدق وخلوص، تواضع، خشوع وخضوع، امر بالمعروف وغیرہ۔

باب چہارم میں ایسے متفرق مسائل کا بیان ہے جو سلوک وتصوف کے یک گونہ موید ہیں۔ اس کے ذیلی موضوعات میں اہم ترین قیود عملیات، حفاظت نفس کا طریقہ، تجلی ذاتی وتجلی مثالی کی تعریف، مجاہد کی توفیق، جذب فضل کا راستہ، مسالک کے واجبات، عبدیت کی تعریف، فضیلت علم، احکام شرعیہ طبعی، مشورہ کی برکت، معیار صحت تعلیم، دوام عمل، وحدۃ الوجود کی حقیقت، مجاہدہ کی حقیقت، محبت وعظمت کے فوائد، استخارہ کامل، نقص عمل واختصار عمل اور جذب کی قسمیں وغیرہ۔ غرض کہ تصوف کے موضوع پر یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں چھوٹے سے چھوٹے تمام نکات بالتفصیل بیان کیے گئے ہیں۔ چند اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) وحدۃ الوجود کی حقیقت اور اس کی ابتداء، وحدۃ الوجود ان حضرات کی خاص حالت وکیفیات کا نام ہے جب غلبۂ عشق ومحبت الٰہیہ سے ان پر وارد ہوتی ہیں۔ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کے سوا تمام چیزیں ہیچ نظر آتی ہیں خواہ وہ خود اپنی ذات ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بھی معدوم ہو جاتی ہے۔

(۲) بغیر اجازت مشائخ شیخ نہ بنے، گو کہ اہلیت رکھتا ہو۔

(۳) کثرت ریاضت اور شدت مجاہدات

(۴) قصداً دھوپ میں ذکر و شغل کے لیے بیٹھنا مشقت مذموم و خلاف سنت ہے۔

(۵) ولی کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ شدت مصائب میں بھی محبت الٰہی میں کمی نہ آئے۔

(۶) عارف کی تعریف بقول امام قشیری یہ ہے کہ عارف اللہ تعالیٰ کو اس کے اسماء و صفات کے ساتھ پہنچانے۔ تمام معاملات میں خلوص و صدق اختیار کرے۔ آفات باطن سے پاک رہے۔

(۷) حسین بن منصور حلاج کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ اولین و آخرین کے علوم کا خلاصہ چار باتیں ہیں، رب جلیل سے محبت، دنیا سے نفرت کتاب منزل کا اتباع، تغیر حال کا خوف۔

(۸) عین الجمع و جمع الجمع کی تحقیق: اس کی حقیقت اصلاح صوفیہ میں یہ ہے کہ سالک کے مخلوق کا مشاہدہ سلب کر لیا جائے۔ حتیٰ کہ اپنی ذات کا مشاہدہ بھی فنا ہو جائے۔

(۹) غیر مقبول سے حسن ظن مضر نہیں لیکن مقبول سے بلا وجہ بدگمانی مضر ہے۔

(۱۰) جبکہ سوءِ ظن کے لیے دلیل قوی کی ضرورت ہے اور حسن ظن کے لیے سوءِ ظن کی دلیل کا نہ ہونا کافی ہے۔

(۱۱) ولی کی بڑی کرامت یہ ہے کہ شدائد مصائب میں بھی محبت الٰہی پر قائم رہے۔

(۱۲) الصوفی لا مذہب لہ کا مطلب (یعنی صوفی کا کوئی مذہب نہ ہونا)

(۱۳) اللہ تعالیٰ سے محبت کا طریقہ

(۱۴) نفس کی نگہداشت کا طریقہ

(۱۵) تصوف کی حقیقت کتاب و سنت کی معرفت

(۱۶) وحدۃ الوجود کا غلبہ ہونا

(۱۷) عقیدت کا تعریف

(۱۸) ہیبت کے مدارج وغیرہ۔

حواشی و حوالہ جات:

(۱) فوائد الفوائد، ص ۶۷

(۲) انفاس عیسیٰ، ص ۳

(۳) انفاس عیسیٰ، ص ۳۳

☆☆☆

انصارالحق (ڈاکٹر)
شعبہ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

خزائن الفتوح کی تاریخی اور ادبی اہمیت

طوطی ہند حضرت امیر خسرو نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام فارسی دنیا کے لئے ایک جامع، برجستہ اور قابل افتخار شخصیت کا نام ہے اور حضرت نظام الاولیاء کی ارادت نے جو روحانی مقام ان کو عطا فرمایا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ایسی عبقری شخصیت پر نازاں ہونا ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے دانشوروں کا حق ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

''ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور اگر سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے ہونگے۔''

امیر خسرو کی شاعری اور زبان دانی کا اعتراف ایرانی شعراء کو بھی ہے۔ وہ قدرتی شاعر تھے اللہ نے ان کو شاعر بنا کر ہی پیدا کیا تھا اس لئے ان کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے۔ ان کی ہمہ گیر متنوع شخصیت اور ان کا کلام ایسا ہے کہ جب بھی اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو نئے نئے نکتوں کی عقدہ کشائی ہوتی ہے اور اشعار کی گہرائیوں سے گوہر آبدار برآمد ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کے عذوبت اور شیرینی کا اعتراف اہل زبان کو بھی ہے اسی لئے ''طوطی ہند'' سے بھی ان کو ملقب کیا گیا ہے۔ ٹھیک اس وقت جب سعدی شیرازی دور مغول میں سرزمین ایران میں اپنی نظم ونثر کے ذریعہ مشرق ومغرب کو مسحور کررہے تھے، اسی زمانے میں ہندوستان کی فضاؤں میں امیر خسرو کی معجزانہ نثر اور لازوال نغموں کی صدا گونج رہی تھی۔ امیر خسرو نے علمی تبحر، بلند پرواز تخیل، اور ہمہ جہت معلومات کے ذریعہ برصغیر کی ادبی، ثقافتیا ور عمومی حالات کو اپنے نظم ونثر میں پیش کر کے ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کی تاریخ کو محفوظ کر دیا۔ ان کی تصانیف میں دیوان، تاریخی مثنویاں اور خمسہ نظم میں اور اعجاز خسروی یا رسایل الاعجاز، افضل الفوائد اور تاریخ علائی یا خزائن الفتوح نثر میں مشہور ہے۔

نظم ونثر میں غیر معمولی مہارت اور قدرت کے ساتھ درباروں سے وابستگی کی بنا پر امیر خسرو تاریخی واقعات کو اپنی نگاہ سے مشاہدہ کررہے تھے اور اسے اپنی تالیفات کا جامہ پہنا رہے تھے۔ خزائن الفتوح بھی اسی ردیف کی تالیف ہے جس کے بارے میں امیر خسرو نے کہا ہے کہ:

این نامہ کہ نقد فتح دارد در جیب
شد نام خزائن الفتوحش از غیب
این نامہ فتح خزائن الفتوح است

ہر گوہر ازو چراغ روح است

یہ کتاب تاریخ علائی اور سرورالروح اور فتح نامہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اور امیر خسرو نے سلطان علاء الدین خلجی کی خدمت میں تقدیم کیا ہے چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

''تا آن گونہ کہ در بحور نظم غوص نمودہ بودم وانبار ہای لآلی گردآوردہ، خواستم کہ برای سدہ والانثری نیز بیارایم۔''

اس کتاب میں خسرو نے سلطان علاء الدین خلجی کی دیوگیر کی فتح سے ۷۱۱ھ تک کی کامیابیوں اور فتوحات کی تفصیل کو بیان کیا ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی کی ۲۱ سالہ طویل حکومت دور سلطنت میں ایک نمونہ ہے پوری مدت میں امیر خسرو اس دربار سے وابستہ رہے اور سلاطین دہلی کے دربار کو اپنی تالیفات سے تازگی عطا کرتے رہے۔ وہ چند تاریخی مثنوی اس سے قبل لکھ کر بادشاہوں کے نام معنون کر چکے تھے۔ اس کتاب میں سلطان علاء الدین خلجی کی سلطنت کے اول پندرہ سال کی تاریخ کو انہوں نے نثر میں لکھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے اوائل میں تاریخ نویسوں نے اکثر عمومی تاریخ لکھی ہیں۔ اور ان میں آفرینش آدمؑ سے لیکر اپنے زمانہ تک کی تاریخ کو موجود منابع کی بنیاد پر اپنی دل پسند طرز واسلوب میں پیش کیا ہے لیکن امیر خسرو نے اس روش سے الگ اپنی پہچان قائم کی۔ مشاہدات کی بنیاد پر نظم ونثر میں اپنے زمانہ کی تاریخ کو لکھا۔ اس کتاب خزائن الفتوح میں ایک طرف انہوں نے فتوحات گجرات (۶۹۸ھ)، رنتھمبور (۷۰۰ھ)، چتور (۷۰۳ھ)، مالوہ (۷۰۵)، اور سیونا (۷۰۸ھ) کو تفصیل سے بیان کیا ہے تو دوسری طرف سلطان علاء الدین خلجی کے اقدامات کا تذکرہ بھی کیا ہے جو انہوں نے رفاہ عام، دفع شر اور اپنی عوام کو امن وسکون فراہم کرنے کے لئے کئے ہیں۔ دوسری تصنیفات میں یہ خصوصیت نہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ امیر خسرو کی ژرف نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ چنانچہ بعد کے مورخین نے اس کتاب سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس زمانہ کے جتنے تاریخی منابع ہیں ان میں خزائن الفتوح کو سب سے اہم مقام حاصل ہے۔ معروف مورخ ضیاء الدین برنی نے تو بار بار اپنی تحریر میں اس کتاب کا نام لیا ہے اور مرجع کے طور پر اس کتاب کو استعمال کیا ہے۔

خزائن الفتوح میں کئی حصے ہیں، ہر پیراگراف کو مولف نے موضوع کی مناسبت سے ایک عنوان کا نام دیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک پیراگراف کا عنوان اس طرح ہے:

'' نسبت راہ ہای نا ہموار'' جس کی عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے: ''راہی پیش آمد بہ غایت ناہموار.....''

امیر خسرو کی یہ تاریخ، اصول تاریخ نگاری کے پیرایہ پر مرتب نہیں ہے، البتہ انہوں نے اپنی تاریخی مثنویوں میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ واقعات کو سال وقوع کے نشاندہی کے ساتھ ساتھ مہینہ، ہفتہ اور دن کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور بیشتر اپنی اطلاعات اور مشاہدات کا بیان کیا ہے لیکن خزائن الفتوح میں انہوں نے اپنی مشاہدات کو اساس تو ضرور بنایا ہے لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ وہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''بعضی از آنچہ معاینہ گشتہ است، بہ اندازۂ تخیل خویش چنانچہ روی دہد نمودار کنم، تا اگر عیب بینان را در

مطبوعات بندہ شکی است، دفع گردد.....''

خزائن الفتوح کی عبارت نثر مصنوع ہے۔ ریو نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ،'' تاج المآثر کی مکمل تقلید اس کی عبارت میں موجود ہے۔'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو کی یہ اپنی روش ہے جس سبک نگارش کے اصول و معانی کو انہوں نے رسائل الاعجاز میں تمام لکھنے والوں کے لئے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

محمد وحید مرزا، لکھنؤ یونیورسٹی کی کوشش سے ۱۹۵۴ء میں انگریزی پیش گفتار کے ساتھ یہ کتاب شائع ہوئی۔ انہوں نے ایک مفصل ضمیمہ شامل کیا جس میں اصل کتاب میں مندرج قرآنی آیات، عربی اشعار، فارسی ترجمہ کے ساتھ اور مشکل الفاظ و عبارات کی تشریح بھی موجود ہے۔ اور اخیر میں اشخاص و اماکن کی فہرست بھی ہے۔ یہی کتاب ۱۹۷۵ء میں دوسری مرتبہ لاہور سے بھی شائع ہوئی۔ خسرو نے اس کتاب میں تشبیہات، کنایات، توصیفات اور خیال پردازی کے ساتھ کثرت سے اشعار کا ستعمال کیا ہے اور مولف نے اپنے ذوق اور اپنے تبحر علمی کا پورا ثبوت دیا ہے لیکن اس تشبیہات و توصیفات میں بعض مقامات پر اتنی شدت ہے کہ اصل واقعہ کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے اور ادبی پیچ وخم کو سمجھنے میں الجھ جاتا ہے۔ مولف کی بیشتر توجہ یہاں پر تاریخی کے بجائے ادبی ہو کر رہ گئی ہے یہی وجہ ہے کہ خزائن الفتوح کا مقام جہاں تاریخی اعتبار سے بلند ہے وہیں اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔

اس کتاب میں خسرو نے عربی کے ۸۶ شعر کا استعمال کیا اگر چہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ:

''نخواستم کہ ہیچ نظم بیگانہ، نہ از عربی و فارسی سر قلم را سیہ گرداند و روی صفحہ را ابلق۔''

لیکن انہوں نے ضرورت اور موضوع کے اعتبار سے ایسے اشعار درمیان میں پرو دئے ہیں جس سے نفس مضمون کی وضاحت میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً سلطان کا لشکر جب سلطان پور معروف بہ ایرج پور پہونچا ہے تو اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے خسرو کہا ہے:

لشکر سلطان ایرج بندہ را
چار روزی در آن منزل مقام

اسی طرح مناسب موقع پر مؤلف نے کثرت سے اشعار استعمال کئے ہیں۔

ماخذ و منابع:۔

۱۔ خسرو دہلوی، امیر۔ خزائن الفتوح۔ تصحیح محمد وحید مرزا۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء
۲۔ شفق، رضا زادہ۔ تاریخ ادبیات ایران۔ ترجمہ مبارز الدین رفعت۔ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔ ۱۹۸۵ء
۳۔ صفا، ذبیح اللہ۔ تاریخ ادبیات در ایران۔ تہران۔ ۱۳۵۵ش
۴۔ مشائخ فریدنی، محمد حسین۔ امیر خسرو دہلوی۔ طوطی ہند۔ کیہان فرہنگی ش ۴۔ تہران ۱۳۶۹ش
۵۔ نعمانی، شمس العلما شبلی۔ شعر العجم۔ معارف پریس اعظم گڑھ۔ ۱۹۷۲ء

سیدہ عصمت جہاں (ڈاکٹر)
شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

فن ترجمہ ادبیات فارسی کے تناظر میں

ترجمہ کسی بھی زبان کے علوم وفنون، شعروادب، کسی بھی ملک وقوم کی تہذیب وتمدن، رسوم ورواج، آئین وقوانین، طرز زندگی وطرز معاشرت، کسی بھی مذہب وملت کی تعلیمات، عقائد وافکار سے آگاہی وآشنائی کا ایک بہترین ذریعہ وزینہ ہوتا ہے۔

فارسی ادبیات میں فن ترجمہ نگاری کی تاریخ وتاسیس عہد ھخامنشی (۳۳۰۔۵۵۰) قبل مسیح سے دستیاب ہوتی ہے۔اس خاندان کے بانی کوروش کبیر Cyrus the great نے ایک ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کی جو مغرب میں مصر اور بحیرہ روم، مشرق میں دریائے سندھ، شمال میں دریائے سیحون اور جنوب میں خلیج فارس اور بحر ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ عظیم الشان وسیع وعریض سلطنت کئی شہروں، کئی تہذیبوں وتمدنوں، کئی زبانوں، کئی مذاہب، کا مجموعہ تھی۔اس عظیم سلطنت میں کئی زبانیں جیسے بابلی، مادی، آسوری، آرامی اور کئی علاقائی بولیاں بولی جاتی تھیں جو ایک ہی مرکزی حکومت کے زیر اثر تھیں لہٰذا یہیں سے ترجمہ کی ضرورت پیدا ہوئی اور اس کا آغاز ہوا چنانچہ ھخامنشی بادشاہوں کے جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں وہ ہمہ لسانی Multi Lingual، مختلف میخی خطوں میں لکھے گئے ہیں۔

کوروش بزرگ بہت نیک اور رحمدل بادشاہ تھا اس نے اپنے معاصر بادشاہوں کی روش سے ہٹ کر تمام مغلوب اقوام سے مہربانی اور ملاطفت کا برتاؤ کیا۔مفتوحہ علاقوں کو آباد کرنے کی کوششیں کی، مغلوب حکمرانوں کو اپنا ندیم اور مصاحب بنایا اور اس طرح شاہان عالم میں حسن اخلاق کی ایک بہت اچھی مثال قائم کی۔لہٰذا کوروش کبیر کو ''ذوالقرنین'' جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے بھی گمان کیا جاتا ہے۔

کوروش کبیر کے جانشینوں میں داریوش بزرگ اردشیر اول وغیرہ نے بھی علوم وفنون کی ترویج میں حصہ لیا اور اردشیر اول کے زمانہ میں ایران ویونان کے ثقافتی روابط میں بہت ترقی ہوئی۔ یونانی عالموں اور محققوں نے سرزمین ایران میں اقامت گزیں ہوکر ایران کے ادبی علمی وہنری ذخیرہ سے بہت استفادہ کیا اور مشرقی علوم اور تاریخ مذاہب میں تحقیق وتجسس کے بعد اپنی کتابوں میں ان موضوعات کو بہت تفصیل سے بیان کیا۔مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے اپنی شہرہ آفاق تاریخ اسی عصر میں لکھی۔شہر سوسا علم وفضل کا مرکز تھا جہاں بڑے پیمانہ پر تصنیف وتالیف اور ترجمے کا کام ہوا۔

داریوش سوم کے عہد میں سکندر مقدونی نے ایران پر حملہ کیا اور تخت جمشید کے مشہور عالم ایوانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، کتب خانوں کو جلا دیا گیا اس طرح سے اس عہد کے تمام علمی آثار ختم ہو گئے۔

سلوکی تقریباً سو سال ایران پر قابض رہے۔ پھر اشکانیوں نے حکومت کی۔ اس دور میں بھی دوسری زبانوں سے علم وادب کی بکثرت کتابوں کا پارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

اشکانیوں کے بعد ساسانی (۳۳۶۔۶۵۰) قبل مسیح برسر اقتدار ہوئے۔ اس عہد میں پھر سے ترجمہ نگاری کو ایک نئی جہت ملی۔ شاہ پوراول نے شاہ روم کو شکست دے کر ستر ہزار رومی سپاہ کو اسیر کرلیا اور بہت سے نئے شہر اور غار بنا کر ان رومیوں کو وہاں قید کر دیا۔ ایرانیوں نے مختلف علوم وفنون مثلاً معماری، مہندسی وغیرہ ان قیدیوں سے سیکھا۔ شاہ پوراول علم وادب کا بڑا سرپرست تھا اس کے حکم سے علم طب، فلسفہ اور نجوم کی بہت سی یونانی اور ہندی کتابوں کا پہلوی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ ساسانیوں کی علم دوستی کے متعلق مولف تاریخ ادبیات ایران لکھتا ہے کہ:

''ساسانیوں کے دور میں فلسفہ وحکمت اور اجتماعی علوم یونانی اور سنسکرت سے پہلوی میں منتقل ہوئے اور انہوں نے ملک کے علم وادب کے خزانے میں اضافہ کیا۔

اخلاقی اور اجتماعی علوم پر اچھی اچھی کتابیں اتنی لکھی گئی تھیں کہ عربوں کے تسلط، عربی زبان کی ترویج اور ایرانی ادیبوں کی کتابوں کے تلف ہونے کے باوجود بہت سی کتابیں پہلی صدی ہجری تک بھی باقی رہیں۔ چنانچہ عربی کتابوں میں ان، کتابوں کے نام لئے گئے ہیں۔ بعض کے مطالب نقل ہوئے ہیں اور بعض عربی میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ چنانچہ ''المحاسن والمساوی یا المحاسن والاضداد'' یا کتاب ''الادب الکبیر'' اور ''الادب الصغیر'' پہلوی زبان کی اخلاقی کتابوں سے اقتباس اور ترجمہ کی گئی ہیں جن کا پہلوی نام ''شایست وناشایست'' تھا۔''

ساسانی حکمران خسرو اول نے ایک عظیم دانشگاہ یعنی دانشگاہ گندیشاپور قائم کی جو علوم وفنون کا ایک بہت بڑا مرکز تھی دنیا کے مختلف خطوں سے اساتذہ بلوائے گئے ارسطو وافلاطون کی یونانی تصانیف کا پہلوی میں ترجمہ کیا گیا اور اسے اس دانشگاہ کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ لاطینی، شامی، یونانی، چینی، مصری اور دیگر زبانوں کی مختلف علوم وفنون جیسے طب، تاریخ فلسفہ، ریاضی، نجوم، ہیئت وغیرہ کی تصانیف کا بھی پہلوی میں ترجمہ کروایا گیا۔ اوستا بھی اسی عہد میں پہلوی زبان میں منتقل ہوئی۔

ساسانی حکمران انوشیروان عادل کے حکم سے ساسانی دانشمند وزیر برزویہ جو کہ طبیب بھی تھا ہندوستان کا سفر کیا اور یہاں سے سانسکرت میں جانوروں کی زبانی اخلاقیات کے موضوع پر لکھی گئی شہرہ آفاق تصنیف ''پنچ تنترہ'' کو اپنے ملک ایران لے جا کر وہاں کلیلہ ودمنہ کے نام سے پہلوی زبان میں منتقل کیا۔ اسی کلیلہ ودمنہ کو فارسی کے باضابطہ تراجم میں اولین

ترجمہ مانا جاتا ہے۔اوراسی ''کلیلہ ودمنہ'' کوعبداللہ ابن مقفع نے عربی کا جامہ پہنایا۔عربی کے اسی ترجمہ کو پھر سامانی عہد میں رودکی سمرقندی نے فارسی نظم کا جامہ پہنایا لیکن افسوس یہ کتاب اب ناپید ہے صرف اس کے کچھ اشعار مختلف کتابوں میں بطور نمونہ باقی رہ گئے ہیں۔

ابن مقفع کے عربی ترجمہ میں کچھ اضافہ کرتے ہوئے چھٹی صدی ہجری عہد غزنوی میں ابوالمعالی نصراللہ بن عبدالحمید منشی نے اس کا دوبارہ فارسی میں ترجمہ کیا اس نے یہ ترجمہ بہرام شاہ غزنوی کے نام معنون کیا اور اسے ''کلیلہ ودمنہ'' بہرام شاہی'' کا نام دیا۔اس نے یہ ترجمہ نہایت سلیس وعمدہ نثر میں کیا ہے لہٰذا یہ کتاب فارسی کی ادبی کتابوں میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔دسویں صدی ہجری میں مولانا حسین واعظ کاشفی نے اس کتاب کو اپنے عہد کی مروجہ فارسی میں ترجمہ کیا اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے اسے ''انوار سہیلی'' کا نام دیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سانسکرت کی اصل کتاب دس ابواب پر مشتمل تھی۔نصراللہ منشی نے اس میں مزید حکایات ''امثال'' اشعار کا اضافہ کرتے ہوئے اسے پندرہ یا سولہ ابواب میں منقسم کیا تھا۔ملا واعظ حسین کاشفی نے انوار سہیلی کو چودہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔انوار سہیلی کا دنیا کی تقریباً زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ترجمہ ہی کی بدولت آج ادبیات عالم اس شہرہ آفاق کتاب سے استفادہ کررہے ہیں۔دوسری طرف یہ کتاب جس کی اصل سانسکرت زبان تھی اب سانسکرت کی ''پنچ تنتر'' ناپید ہے۔یا یوں کہیے دردست نیست اس کے برخلاف عربی اور فارسی تراجم کے وسیلے سے دنیا کی تقریباً زبانوں میں اس کے تراجم ہو پائے اور ادبیات عالم کے طالب علم اس سے استفادہ بھی کررہے ہیں۔

غرض عہد ساسانی میں ترجمہ نگاری پر بہت توجہ دی اور دنیا کی دیگر زبانوں کے علوم وفنون کے ترجمہ سے ادبیات پہلوی (فارسی) کا دامن وسیع ہوا۔ساسانی عہد کے آخری فرمانروا یزدگرد سوم کے عہد میں عربوں نے ایران پر حملہ کردیا اور پورا ایران عربوں کی تاخت وتار کا میدان بن گیا۔ایران کی سلطنت خلافت کے تابع ہوگئی اور تقریباً دوسو سال تک عرب ایران پر قابض رہے۔

حملہ عرب کے وقت سکندر کے عہد کے اور ساسانی عہد کے کئی کتب خانے اور میوزیم تباہ کردیئے گئے۔جس کی وجہ سے کئی کتابیں ہم تک نہیں پہنچ پائیں۔

اسی عہد میں کئی کتابیں پہلوی (قدیم فارسی) سے عربی زبان میں ترجمہ ہوئی جیسے ''خدای نامک'' کو ابن مقفی نے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔خدای نامک ایرانی بادشاہوں کی ایک تاریخ ہے جو پہلوی میں لکھی گئی ہے۔ابن مقفیٰ کا عربی ترجمہ بھی اصل پہلوی کی طرح ناپید ہوگیا ہے۔صرف سوانح اور تاریخ کی چند کتابوں میں اس کے اقتباسات باقی رہ گئے ہیں۔ابن مقفی نے بہت سی پہلوی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔پہلوی زبان سے ان کے ترجموں میں سب سے اہم

''کلیلہ ودمنہ'' ہے جو ابھی تک باقی ہے اور عربی ادب کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔لیکن افسوس اصل پہلوی کا ترجمہ اب ناپید ہوگیا ہے۔

غرض ایران تقریباً دوسو برس تک عربوں کے زیر اثر رہا ظاہراً فارسی زبان وادب بھی عربی زبان کے زیر اثر رہا۔اس کے نتیجہ میں کئی عربی الفاظ فارسی زبان کا حصہ بن گئے۔اور کئی فارسی الفاظ عربی میں داخل ہوگئے۔اور وہ تمام تراجم جو پہلوی سے عربی میں ترجمہ ہوئے تھے بعد میں اسی عربی ترجمہ سے پھر فارسی (جدید) میں ترجمہ ہوا۔

بعد از اسلام کے ادوار میں سب سے پہلے طاہری اور (۲۰۵۔۲۵۹) اور صفاری (۲۴۵۔۲۹۰) دور ہیں ان ادوار میں ترجمہ کے کچھ اہم آثار کی نشاندہی نہیں ہوتی البتہ ان کے بعد عہد سامانی (۲۶۱۔۳۸۹) کا آغاز ہوتا ہے جسے صحیح معنوں میں فارسی کے احیاء کا دور کہا جاسکتا ہے۔سامانی بادشاہ جیسے نوح بن نصر، نوح بن منصور وغیرہ اور ان کے وزراء ابوالفضل بلعمی وابوعلی بلعمی وغیرہ بڑے علم دوست ودانش پرور تھے انہوں نے علوم وادبیات کی ترویج میں بڑی کوششیں کی۔اس عہد میں بخارا وسمرقند علم وفضل کا مرکز تھے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بعد اسلام فارسی نظم ونثر کی باضابطہ بنیاد اسی دور میں رکھی گئی۔اسی عہد میں سلطان ابوصالح منصور بن نوح بن نصر احمد بن اسمعیل نے اپنے عہد حکومت میں قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ابن جریر طبری کی تفسیر ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' کا ترجمہ مختصر فارسی میں کروایا اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہ فارسی کا پہلا لفظی قرآنی ترجمہ تھا اس کے علاوہ محمد جریر طبری کی تاریخ کا بھی منصور بن نوح سامانی کے حکم سے فارسی میں ترجمہ کیا گیا جو تاریخ میں ''تاریخ طبری'' کے نام سے مشہور ہے۔اس کا مترجم عبدالملک بن نوح اور منصور بن نوح کا وزیر ابوعلی محمد بلعمی تھا۔یہ ترجمہ تاریخ اس عہد کی طرز تحریر کی ایک بہترین مثال مانا جاتا ہے اس کے علاوہ رودکی سمرقندی نے ابن مقفیٰ کی عربی کلیلہ ودمنہ کا فارسی میں منظوم ترجمہ کیا جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔

اس کے علاوہ اس کے بعد کے ادوار جیسے غزنوی، سلجوقی، مغل وتیموری سے لے کر عہد صفوی تک فارسی زبان میں تخلیقی ادب پر بہت کام ہوا۔بے شمار بلند پایہ شاعر وادیب پیدا ہوئے۔مختلف علوم جیسے تاریخ، تصوف، طب، لغت، انشاء، نجوم، جغرافیاء، شاعری وغیرہ پر بے شمار تصانیف لکھی گئی۔ان ادوار میں ترجمہ پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی کیوں کہ اب اس کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

عہد قاچاری (۱۹۰۵۔۱۷۹۴) سے ایران میں ''ترجمہ کی تاریخ میں انقلاب آیا۔یوں تو صفوی دور سے ہی ایرانی اسکالرس کا یوروپی ممالک جانے کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔انگلینڈ سے واپس آکر صالح شیرازی نے تبریز میں پہلا پرنٹنگ پریس کھولا اور اخبار'' کاغذ اخبار'' نکالنا شروع کیا۔اس کے ساتھ ہی ایران میں یورپی زبانوں سے فارسی میں ترجمے بڑے زور وشور سے ہونے لگے۔محمد رضا مہندس جو آرمی انجینئر تھے انہوں نے انگریزی کی کئی مشہور کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

ناصرالدین شاہ قاچار اوران کے وزیر امیر کبیر نے ایران میں کئی چھاپے خانے کھولے پہلا ماڈرن اسکول دارالفنون کھولا گیا جس میں کئی یورپی اساتذہ رکھے گئے اور کئی یورپی زبانوں سے ماڈرن علوم، سائنس وٹکنالوجی کی کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئی۔

دارالفنون کے فارغین میں سب سے نمایاں نام محمد حسن خان کا آتا ہے انہوں نے The Royal Office of Translation کے نام سے ایک ادارہ بنایا۔ محمد حسین خان فروغی ذکاء الملک ترجمہ کے ماہر تھے یہ وہاں عربی وفرنچ کی خبریں اور مقالے فارسی میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس دور میں فارسی کے قدیم طرز کو جدید طرز میں ڈھالنے کا رواج ہوا اس خصوص میں اخوند زادہ امین الدولہ، اعتماد السلطنت، محمد حسین خان فروغی، مرزا حبیب اصفہانی، پرنس طاہر مرزا، رضا قلی ہدایت۔ طالبوف، یوسف مستشرالدولہ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

عہد قاچار کی ابتداء میں یورپی زبانوں نے بالخصوص فرانسیسی زبان نے ایران میں قدم رکھا اور ان زبانوں کا رواج ہوا۔ اہل ایران کا یورپی ممالک آنا جانا زیادہ ہونے لگا اور ایرانی یورپی زبانوں کے ادبیات سے متاثر ہونے لگے اس کے نتیجہ میں بہت سی یورپی زبانوں کی کتابیں فارسی میں ترجمہ ہونے لگیں۔

ان تراجم کی بدولت فارسی ادبیات میں نئے موضوعات جیسے آزادی نسواں، آزادی افکار، آزادی فطرت، سیاسی حقوق کا حصول، وطن پرستی یورپی اقدار، سائنس وٹکنالوجی وغیرہ نے راہ پائی۔ بہت سے فرنچ، جرمن، روسی الفاظ بھی فارسی میں شامل ہوگئے۔

Press and poetry in moderin persian کے مولف نے ایران میں یورپی زبانوں خصوصاً فرانسیسی کتب کے فارسی تراجم پر بہت مفصل بحث کی ہے جو ایرانیوں کی یورپ اور وہاں کی زبانوں کے ساتھ گہری دلچسپی کی وجہ سے کئے گئے۔ مثلاً مولیر (Molier) کے بعض ڈراموں یا جولس ورن (Jules Verne) کی ناولوں کے ترجمے وغیرہ اس کے علاوہ Dumas the elder ,fenelon ,Bernardin de sint plerre , Le sage ,Danid Defoe وغیرہ کے آثار بھی فارسی میں ترجمہ ہوئے۔

غرض ان تراجم نے نہ صرف فارسی ادبیات کے دامن کو وسیع کیا اور فارسی شعر ونثر کو نئے موضوعات دیئے بلکہ ایران کو جدیدیت Modernisation سے ہم کنار کرنے میں بھی نہایت اہم رول ادا کیا۔

گیارھویں صدی عیسوی میں سلطان محمود غزنوی کے ساتھ فارسی اپنے دوسرے مرکز ہندوستان منتقل ہوئی۔ اور یہاں تقریباً آٹھ سو سال خوب پھلی پھولی، مختلف دورۂ حکومتوں جیسے دورۂ سلطنت دورۂ تغلخیاں، دور خلجیان، عہد مغل، عہد بہمی، عہد عادل شاہی، قطب شاہی، برید شاہی، نظام جاہی اور آصف جاہی کے دربار کی زبان رہی اسے شاہانہ سرپرستی حاصل

ہوئی۔یہی نہیں بلکہ یہاں کے اہل ہنود نے بھی فارسی زبان کی پرورش و پراخت میں حصہ لیا۔

سرزمین ہند میں فارسی کے سینکڑوں بلند پایہ شاعر وادبی پیدا ہوئے ۔مختلف علوم وفنون پر سینکڑوں تصانیف لکھی گئی ۔ساتھ ہی ترجمہ کا کام بھی ہوتا رہا خاص طور پر عہد مغل میں جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں مختلف زبانوں کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا اسی طرح سے دیگر زبانوں کی کتابوں بالخصوص رامائین ،مہابھارت، بھاگوت گیتا' وید، پران ،اپنیشد ، پنچ تنتر ،سنگاسن بتیسی ،کو فارسی نظم ونثر کا جامہ پہنایا گیا۔

انیسویں صدی کے وسط سے ہی ہندوستان میں فارسی کے عروج کی رفتار کچھ ماند پڑنے لگی تھی۔

انیسویں صدی کے ابتداء تک اقبال لاہوری اپنے قلم سے فارسی زبان کے افق پر روشنی بکھیرتے رہے۔

۱۹۳۱ء میں علامہ اقبال کے انتقال کے بعد سے ہندوستان میں فارسی کی جھلملاتی شمع کو فارسی کے اساتذہ نے اپنے خون جگر سے روشن رکھا اس خصوص میں علامہ شبلی نعمانی سے امیر حسن عابدی تک سینکڑوں اساتذہ کے نام ملتے ہیں جنہوں نے فارسی میں تدریس، تحقیق ،تنقید، تخلیق اور ترجمہ کے ذریعہ فارسی کو ہندوستان میں زندہ رکھا ہے۔

ہندوستان میں فن ترجمہ پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی بیشتر کتابوں کے تراجم ہو چکے ہیں اس سے یہ ہوا کہ جس زبان میں ترجمہ کیا گیا اس زبان کے ادب کا دامن تو وسیع ہوا مگر فارسی کے قارئین کی تعداد گھٹ گئی ہر کوئی فارسی ادب کے شاہ پارہ کو اپنی زبان میں پڑھنے اور محظوظ و مستفیض ہونے لگا۔

طب ،تاریخ ،تصوف ، وغیرہ کی بیشتر کتابیں فارسی ہی میں ہیں ترجمہ کی وجہ سے ہوا یہ کہ اصل فارسی متن ندارد اور تراجم بکثرت دستیاب ہیں ۔جیسے کہ ہندوستان میں فارسی میں لکھی گئی تصوف کی پہلی کتاب ''کشف المحجوب'' کے بکثرت اردو ،انگریزی ،تراجم بازار میں مل جاتے ہیں لیکن اصل فارسی متن مشکل ہی سے ملتا ہے۔اور کئی کتابیں ایسی ہیں جو ابھی مخطوطہ کی شکل میں ہیں لیکن ان کے تراجم ہو چکے ہیں جیسے مرآۃ الاسرار، اقتباس الانوار وغیرہ ہیں اصل متن کے متعلق دریافت کیا جائے تو بتایا جاتا ہے کہ فارسی پڑھتا کون ہے اسی غلط سوچ وفکر کے مدنظر ترجمہ نگاروں نے بھی ستم بالائے ستم والا معاملہ کیا وہ ترجمہ کو بغیر متن کے شائع کرنے لگے۔اور اسی وجہ سے فاش غلطیوں ،غلط ترجمانی ،تعصب ،تنگ نظری وکوتاہ ذہنی نے ترجمہ میں راہ پالی ۔اگر ایک ہی جگہ متن اور اس کا ترجمہ ہو تو غلطیوں کی اصلاح قاری کے اختیار میں راہ پاتی ہیں ۔اور دیگر کوتاہیوں اور خامیوں کی گنجائش بھی کم ہی ہوتی ہے۔

مختلف علوم وفنون کی لاتعداد کتابیں ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں مخطوطہ کی شکل میں محفوظ ہیں ۔اب ضرورت ہے تو اس بات کی کہ اس کے قارئین ہوں ،ان شاہ پاروں کو زیور طبع سے آراستہ کیا جائے ان کے تراجم بھی ہوں مگر متن کے ساتھ تاکہ غلطیوں کی گنجائش کم ہو اور اصل متن بھی محفوظ ہو جائے ۔اس خصوص میں مختلف فارسی ریسرچ سنٹرز میں اور مختلف

یونیورسٹیوں میں شعبہ فارسی کے تحت تدوین وتحقیق کے سلسلہ میں پیشرفت ہورہی ہے۔ کئی اہم اور مفید تصانیف جو صدیوں سے گردوغبار کا جامہ اوڑھے تھیں اب زیور طبع سے آراستہ وپیراستہ ہوکر ادب شناسوں کی نظر نواز ہورہی ہیں۔

ترجمہ اصل کا متبادل تو نہیں ہوسکتا لیکن ترجمان ضرورت ہوتا ہے لہٰذا اس خصوص میں کوشش ضرور ہونی چاہیے کہ غلط ترجمانی نہ ہو۔ یہ ایک غلط خام تاثر وفکر ہے کہ ہندوستان میں فارسی کا چلن رواج ختم ہوگیا ہے برصغیر، ہندوپاک میں فارسی اب بھی زندہ ہے باقی ہے بغیر کسی شاہی، ملکی وسیاسی سرپرستی کے۔ فارسی زبان میں آب وتاب اور اس کے ادب میں وہ جان وشان ہے کہ کسی بھی زبان کا ادب فارسی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ فارسی کے شاہ پارے، گلستان، بوستان، رباعیات عمر خیام، مثنوی معنوی، شاہ نامہ فردوسی، دیوان حافظ وغیرہ کے ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہوچکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔ اس سے فارسی زبان کی مقبولیت میں اضافہ اور ادبیات عالم کا دامن وسیع ہوا ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں جو فارسی زبان کا دوسرا اہم مرکز مانا جاتا ہے۔ فارسی زبان میں کثرت سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں لکھی گئی اور اسی کثرت سے اس کے تراجم بھی ہوئے۔ اور انہی تراجم کے سبب فارسی قارئین کی تعداد گھٹ گئی۔ ہر زبان والا اپنی زبان میں فارسی کے تراجم سے استفادہ کرنے لگا۔ ہندوستان میں فارسی کے زوال کے دیگر اسباب میں ایک سبب اس کے دوسری زبانوں میں تراجم بھی ہیں۔ ہندوستان کی تقریباً علاقائی زبانوں جیسے پنجابی، گجراتی، ملیالی، کنڑ، مراٹھی، تلنگی، دکنی وغیرہ نے بھی فارسی زبان کے اثرات قبول کئے اور کئی فارسی الفاظ ان زبانوں کا حصہ بنے۔ ان زبانوں میں بھی فارسی کے مشہور آثار کے ترجمے ہوچکے ہیں۔

زبان اردو جسے دختر فارسی کہا جاتا ہے۔ اردو زبان کو حسن وزیبائی کے ساتھ ورثہ میں فارسی کی شیرینی وحلاوت، شگفتی ورعنائی بھی حاصل ہوئی ہے۔

امام الھند مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو زبان کی دلکشی وشادابی میں فارسی زبان کی شیرنی وشگفتگی کو آمیخت کرتے ہوئے ایک بے مثال نمونہ پیش کیا جو ہمیشہ اس حقیقت کو آشکار کرتا رہیگا کہ اردو زبان کے حسن میں جب فارسی زبان کی حلاوت شامل ہوجائے تو ایسی تحریر انمول کہلائے۔

آج فارسی زبان ایران، افغانستان، تاجکستان، ازبکستان، آذربیجان، ارمینیا، جارجیا، ساؤتھ رشیا، عراق، ترکمنستان، قذکستان، ترکی برصغیر ہندوپاک کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی بولی سمجھی جاتی ہے اور اس میں تصنیف وتالیف کے علاوہ ترجمہ کا کام بھی جاری ہے۔

☆☆☆

نیلوفر حفیظ (ڈاکٹر)
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی

قدیم ہندوستان میں فن صحافت

حضرت انسان کے مزاج میں روز اول سے ہی خالق کائنات کی طرف سے یہ صفت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ اپنے ھم جنسوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اطلاعات حاصل کرنے کی متمنی رہتا ہے قرب وجوار، اطراف واکناف اور دور ودراز کے تمام حالات سے واقف رہنے کی خواہش بھی اس میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ جب سے انسان نے عقل وشعور کے دامن کو تھاما ہے اسی وقت سے خبروں کی آمد ورفت کا سلسلہ بھی جاری وساری ہے ابتدائی زمانے میں خبر رسانی کے اس فریضہ کو مسافروں، سیاحوں اور تاجروں وغیرہ کے قافلوں کے ذریعے انجام دیا جاتا تھا یہ لوگ ادھر ادھر گھوم کر خبریں حاصل کرتے، اپنے علاقے، قصبہ یا شہر وغیرہ میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات سے دور دراز کے لوگوں کو باخبر کرتے اور جب لوٹ کر اپنے مسکن کی طرف واپس آتے تو آس پاس کے لوگوں کو دوسری جگہ کے حالات سے مطلع کرتے تھے اس وقت خبر رسانی کے وسائل محدود تھے خبریں ایک کان سے دوسرے کان تک پہنچائی جاتی تھیں یعنی قلم اور رسم الخط کی ایجاد سے قبل خبر رسانی کی روایت سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی تھی لیکن گزرتے وقت کے ساتھ جیسے جیسے انسانی تہذیب نے ترقی کی منازل کو طے کیا تو خبر رسانی کے طریقوں میں بھی تغیرات وتبدلیاں آتی چلی گئیں۔

ہندوستان کی تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم سے ہی ھندوستان میں خبر رسانی اور اخبار نویسی کا باقاعدہ نظام موجود رہا ہے قبل اس کے کہ ہم ہندوستان کی قدیم خبر رسانی کے سلسلے میں گفتگو کریں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحافت کے معانی ومفہوم اور اخبار نویسی کی اہمیت وافادیت پر ایک سرسری نگاہ ڈال لیں، اردو زبان میں کثرت سے استعمال ہونے والا یہ لفظ صحافت عربی زبان کے لفظ صحف سے اخذ کیا گیا ہے اس کے معنی صفحہ، کتاب یا رسالہ کے ہیں صحیفہ کے لغوی معنی ایسی چیز کے ہیں جس پر تحریر کیا جاسکے اسی مناسبت سے ورق کے ایک جانب یعنی صفحہ کو بھی صحیفہ کہا جاتا ہے جدید عربی لغات میں صحیفہ بہ معنی جریدہ اور اخبار کے مستعمل ہے دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ صحافت ایک ایسی داستان کا نام ہے جس میں روز وشب میں رونما ہونے والے واقعات، حادثات اور سانحات کو بغیر کسی کم وبیش کے بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ اس کے محدود معنی ہیں حقیقتاً صحافت کا دائرہ بہت وسیع اور کشادہ ہے یہ محض واقعات وحالات تحریر کر دینے کا نام ہرگز بھی نہیں بلکہ یہ وہ فن ہے جو انسانی تجسس، ذوق پیہم اور کشف اسرار سے عبارت ہے اور ہر کس وناکس اس

فن کی باریکیوں تک رسائی نہیں پا سکتا سید اقبال قادری صاحب نے فن صحافت کی پیچیدگیوں اور دشوار گزار مراحل کا ذکر کرتے ہوئے اس فن کے متعلق اظہار خیال اس طرح کیا ہے:

''تلاش و جستجو اخبار نویسی کی آبرو سمجھے جاتے ہیں صحافت انکشافات ہی کی پروردہ ہے جستجو سے حالات کی تصدیق ہوتی ہے اطلاع اہم ہو یا غیر اہم، خبر متوقع ہو یا غیر متوقع جستجو ہی سے ملتی ہے حقایق کی تلاش، بلند نگاہی اور اعلیٰ ظرفی سے کی جائے تو منزل جلد اور آسانی سے نصیب ہوتی ہے'' ۱

صحافت یا خبر نویسی بظاہر تو ایک سیدھا، سادہ اور عام سا عمل نظر آتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک مشکل، پیچیدہ اور دقت طلب فن ہے اس فن میں ہمیشہ بیداری، زود فہمی، ہوشمندی اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس میں حیات انسانی کو ہر دن ہر لمحہ نئی اطلاعات، تعجب خیز حالات، انوکھے واقعات، حیرت انگیز انکشافات اور متحیر کن حوادثات سے سابقہ پڑتا ہے لہٰذا اس فن کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے بڑی جانفشانی اور تجربہ درکار ہوتا ہے صحافی کی ذرا سی لغزش یا بھول کبھی کبھی ناقابل تلافی نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے دانشوروں نے فن صحافت کو مشکل ترین فن شمار کیا ہے جناب مشتاق صدف نے اس فن صحافت کی باریکی کو بڑے ہی موثر انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''صحافت دراصل خوردبین آلہ ہے جس کے ذریعہ ہم انتہائی چھوٹے چھوٹے واقعات کو انتہائی وسیع تناظر میں دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں صحافت ایک جستجو، ایک تلاش اور ایک ایسی ساخت ہے جس سے ہم ان نامعلوم تاریک جزیروں کی زیارت کرتے ہیں جہاں آنکھیں کبھی نہیں پہونچ سکتی ہیں، صحافت تو درحقیقت نام ہے ان دھڑکنوں کا جنہیں ہم محسوس نہیں کر سکتے، اس دھند کا جسے ہم نہیں دیکھ سکتے صحافت ایک بہت مشکل اور پیچیدہ عمل ہے صحافت کی راہیں بڑی دشوار ہیں صحافت کی آخری منزل تک صرف وہی پہونچ سکتا ہے جس کے پاس چشم بینا اور دل دردمند ہو'' ۲

ہندوستان میں قدیم زمانے سے ہی لفظ صحافت وقائع نگاری، روزنامچہ نویسی اور خبر ناموں کے لئے مخصوص ہو گیا تھا جب اس ملک میں بادشاہتیں قائم ہوئیں تو انتظام حکومت کو ٹھیک ڈھنگ سے چلانے اور دشمنوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لئے پرچہ نویس، خبر نگار اور جاسوس مقرر کئے جاتے تھے تاکہ حکومت کے نظام میں رخنہ اندازی کرنے والے شر پسندوں کی سرکوبی کی جا سکے ہندوستانی خبر نویسی کے سلسلے میں اولین دستاویز منومہاراج کی قانونی تصنیف ''منو سمرتی'' ہے اس کتاب کی درست سن تصنیف کا تو علم نہیں ہوسکتا ہے لیکن خبر رسانی سے متعلق یہ ھندوستان کی قدیم ترین تصنیف تصور کی جاتی ہے، منومہاراج نے سلطنت کی اطلاعات کی فراہمی کے لئے بہت سی ہدایات جاری کر رکھیں تھیں اور انتظامی معاملات کو درست ڈھنگ سے چلانے کے لئے محکمۂ اطلاعات کو دو شعبوں میں تقسیم کر دیا تھا پہلا امور داخلہ جس

میں جاسوسوں کے ذریعے حکومت کو خبریں پہونچائی جاتی تھیں دوسرا امور خارجہ جس کے ذریعے سفیر دوسرے بادشاہوں کی کارگزاریوں سے متعلق حکومت کو بروقت اطلاعات فراہم کرتے تھے اور اپنی حکومت کے پیغامات دوسری حکومتوں کو پہونچا یا کرتے تھے منو کے یہاں خبر نویسی کے اس ابتدائی نظام میں گاؤں کو بنیادی حیثیت حاصل تھیں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں خبریں منتقل ہوتی تھیں اور حاکم وقت تک پہونچتی تھیں اس سلسلے میں امداد صابری منوسمرتی کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''گاؤں میں کچھ واردات ہوتو گاؤں کا مالک دس گاؤں کے مالک سے کہے، اور وہ بیس گاؤں کے مالک سے کہے، بیس گاؤں کا مالک سوگاؤں کے مالک سے کہے اور وہ ہزار گاؤں کے مالک سے کہے'' [۳]

منوسمرتی کے بعد خبر رسانی کے نظام سے متعلق ۳۰۰ ؍قبل مسیح کی تصنیف ''ارتھ شاستر'' کے بارے میں پتہ چلتا ہے اس کا مصنف کوٹلیہ ہے جو چندر گپت موریہ کا وزیر اعظم تھا چندر گپت موریہ کے عہد حکومت میں محکمہ خبر رسانی کو خاص طور پر ترویج وپیش رفت حاصل ہوئی اس دور میں باقاعدہ طور پر محکمۂ تفتیش بھی قائم کیا گیا تھا اس محکمہ کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ دربار کے امراء، وزراء اور عوام کی ہر نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے فرائض انجام دیتا تھا اور اگر کہیں بھی کسی قسم کی گڑبڑی کا پتہ چلتا تھا تو اس کی اطلاع فوراً حکومت کو دیتا تھا تاکہ حکومت کو اندرونی وبیرونی مخالفتوں کو فرو کرنے میں زیادہ دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے، مختلف ذرائع سے دستیاب ہونے والی خبروں کا باقاعدہ طور پر آپس میں محاسبہ وموازنہ کیا جاتا تھا اور اگر ان میں باہمی مطابقت موجود نہ ہوتی تھی تو نامہ نگاروں یا روزنامچہ نویسوں کو شدید سزائیں دی جاتیں تھیں جاسوسوں اور خبر نگاروں کے لئے سخت قوانین اور ضوابط بنائے گئے تھے تاکہ بادشاہ کے پاس صحیح اور مصدقہ خبریں پہونچیں جاسوسی کے فرائض انجام دینے کے لئے عام طور پر پس ماندہ اور لاوارث لوگوں کو ترجیح دی جاتی تھی اور ان کو باقاعدہ طور پر خبر رسانی کی تعلیم دی جاتی تھی ایسے لوگ جن کے ذمہ خبر رسانی ہوتی تھی وہ بھیس بدل کر اور ادھر ادھر گھوم گھوم کر خبریں حاصل کرتے اور بغیر کسی کم وبیش کے بادشاہوں کے حضور میں پہونچاتے تھے اور اپنے فرائض انجام دینے میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔

راجہ اشوک کے عہد حکومت میں بھی خبر رسانی کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا گیا تھا اس محکمہ کے خبر رساں عام طور پر پلسانی کہے جاتے تھے عام طور پر یہ لوگ ایک خفیہ اور نافہم رسم الخط میں خبریں لکھا کرتے تھے اور مطلوبہ مقامات پر اعلانات کے ذریعے ان خبروں کو پہونچایا جاتا تھا یا پھر کتبوں پر شاہی فرمان کندہ کرادیئے جاتے تھے تاکہ عام لوگوں تک بروقت خبریں پہونچ سکیں اس کے علاوہ دور دراز کے علاقوں میں تربیت یافتہ کبوتروں کے ذریعہ پیغام رسانی کا طریقہ رائج تھا لیکن اس

عہد میں سب سے زیادہ اہمیت اور رواج کتبوں کے ذریعے خبر رسانی کو حاصل تھی عام طور پر کتبوں پر کندہ کی گئیں خبریں زیادہ معتبر اور مستند تصور کی جاتی تھیں اس دور کی خبر رسانی سے متعلق جیسا کہ جناب محمد عتیق صدیقی صاحب نے لکھا ہے:

''اس زمانے کی سرکاری قوانین، مذہبی احکام اور اخلاقی اصول ستونوں اور چٹانوں پر کندہ کر کے لوگوں تک پہونچائے جاتے تھے پھران ستونوں کی جگہ تانبے کی چادریں استعمال کی جانے لگیں'' ۴

مہاراجہ اشوک کے بعد دیگر ہندوستانی راجاؤں کے عہد حکومت میں ذرائع اطلاعات کی فراہمی کس طرح انجام دی جاتی اس سلسلے میں کوئی بھی تسلی بخش معلومات دستیاب نہیں ہوتیں ہماری اس عدم واقفیت کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ ہندو اقوام کی تاریخ نویسی سے نا آشنائی وعدم دلچسپی نظر آتی ہے فاھیان اور ہیوٹن سانگ (یہ دونوں چینی سیاح تھے فاھیان پانچویں صدی عیسوی میں اور ہیوٹن ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا ان دونوں کے سفرناموں میں قدیم ھندوستان سے متعلق کافی مواد ملتا ہے) جیسے دقیق بین اور کشادہ ذہن سیاحوں نے بھی اس موضوع پر کسی قسم کی کوئی اطلاعات بہم نہیں پہونچائی ہیں لہٰذا خبر رسانی سے متعلق مہاراجہ اشوک کے بعد کوئی تفصیلی مواد فراھم نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بھی بات وثوق اور حتمی طور پر نہیں کی جاسکتی ہے صدیوں بعد جب ہندوستان میں مسلم بادشاہوں کی حکومتیں قائم ہوئیں تو خبر رسانی کے خدوخال اور ابتدائی نقوش جو کو وقت کی گرد کے سبب دھندلا گئے تھے بار دیگر واضح اور روشن ہونا شروع ہوئے مسلمان فاتحین نے خبروں کی ترسیل کے لئے باقاعدہ و باضابطہ نظام قائم کیا سب سے پہلے محمود غزنوی کے دیوان رسائل کے منشی ابوالفضل بیہقی نے خبر رسانی کے نظام کو تقویت بخشی بیہقی کی اطلاعات کے مطابق سلطان محمود غزنوی کی حکومت میں اخبار واطلاعات، رسل ورسائل کے ساتھ جاسوسی کا بھی ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا تھا کبوتروں سے بھی خبر رسانی کا کام لیا جاتا تھا غزنویوں کے دور حکومت میں قاصد بھی ہوا کرتے تھے ایک مرتبہ انہیں قاصدوں کے بروقت آنے کی وجہ سے مسعود غزنوی کے لئے ابراھیم اور فرخزاد کی جان بچی ہے۵ غزنوی حکمرانوں نے خبروں کی ترسیل کے لئے ''برید'' کا نظام قائم کیا تھا اس نظام کے تحت پیغام تیز رفتار گھوڑوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچائے جاتے تھے گھوڑوں پر ڈاک کی ترسیل آسان ہوگئی تھی اس کے علاوہ اس دور میں کبوتروں کو آموختہ کر کے ان سے بھی خبر رسانی کا کام لیا جاتا تھا مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزنوی دور میں اخبار رسانی نظم زندگی کا لازمی عنصر سمجھا جاتا تھا۔

خبر رسانی کی روایت غزنویوں سے غوری خاندان میں منتقل ہوئی غوری حکومت میں اطلاعات کی ترسیل کا انتظام کس قدر جامع اور عمدہ تھا اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس عہد کی بیشتر تاریخیں اس دور کے خبر ناموں سے استفادہ کرتے ہوئے ہی تحریر کی گئی ہیں مثلاً منہاج السراج کی معرکۃ الآرا تصنیف ''طبقات ناصری'' میں متعدد نامہ نگاروں اور وقائع نویسوں کے حوالے موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے نامہ نویسوں اور وقائع نگاروں کی خبروں

کو اپنے پیش نظر رکھا ہے وہ بار بار لکھتا ہے کہ فلاں معتبر اشخاص واقعے کے راوی ہیں جب غوریوں نے غزنی کو تباہ و برباد کیا تو اس تباہی و بربادی کی داستان کو نامہ نویسوں نے قلمبند کیا اور منہاج سراج نے نامہ نویسوں کی ان رودادوں سے خوب استفادہ کیا ہے ذیل کے اقتباس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دور میں تمام تر دشوار گزار مرحلوں و فاصلوں کے باوجود بھی خبر نگاری کا شعور کتنا پختہ اور بالیدہ تھا:

''نامہ نگاروں کا بیان ہے کہ ان سات دنوں کے دوران دھوئیں کے بادلوں نے فضا کو اس قدر تاریک کر رکھا تھا کہ دن پر رات کا گمان ہوتا تھا اور رات کے وقت شعلوں کی لپک اس قدر بلند ہوتی تھی کہ رات کو دن کا دھوکہ ہوتا تھا سات دن تک لوٹ مار، تباہی و بربادی اور قتل وخون کا سلسلہ جاری رہا ہر مرد جو نظر آیا تہہ تیغ کر دیا گیا اور تمام عورتیں و بچے قیدی بنا لئے گئے فاتح کے فرمان تھا سامان پر محمود، مسعود اور ابراہیم کے سوا باقی تمام محمود بادشاہوں کی لاشیں قبروں سے گھسیٹ کر نکالی گئیں'' ۶

قطب الدین ایبک ۱۲۰۶ء میں جب دہلی میں تخت نشین ہوا تو اس بادشاہ خردافروز نے خبروں کی ترسیل کے نظام کو اور زیادہ بہتر و مستحکم بنانے کی کوشش کی اس نے جلد از جلد خبر رسانی کے لئے نامہ نویسیوں کا ایک مستقل عملہ قائم کیا اس عملہ کے کارندوں کا سب سے پہلا اور اہم کام بیرونی حالات سے بادشاہ کو مطلع کرنا تھا قطب الدین ایبک کے بعد اس کے جانشینوں نے برید کے نظام کو درخور اعتناء تصور نہ کرتے ہوئے اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالی جس کا نتیجہ یہ ہوا ڈاک کے نظام میں قدرے کمزوری پیدا ہوگئی لیکن سلطان غیاث الدین بلبن نے خبر رسانی کے نظام کی ارزش واہمیت کو لازمی تصور کرتے ہوئے اس طرف خاص توجہ دی اور اس کہنہ و نیم مردہ نظام کو از سر نو تقویت بخشی مشہور تاریخ نویس ضیاء الدین برنی نے اس دور کی خبر رسانی سے متعلق بہت قیمتی معلومات بہم پہونچائی ہیں مثلاً وہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''تاریخ فیروز شاہی'' میں اس عہد کی برید کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''سلطان بلبن عدل گستری کا خاص اہتمام کرتا تھا اس کے عہد میں مملکت کے ولایات واقطاعات میں صرف معتبر بریدوں کا تقرر ہوتا، بڑے شہروں، مشہور خطوں اور دور دراز علاقوں میں وہ خود اپنے پاس برید مقرر کر کے بھیجتا جب تک وہ کسی شخص کے متعلق یہ نہ جان لیتا کہ وہ سچا اور ایمان دار ہے وہ کسی بڑی جگہ اس کو برید مقرر نہ کرتا اگر کسی برید کی غلط کاری کا اس کو علم ہو جاتا تو اس کو نظر انداز نہ کرتا اور انصاف کرتے وقت کسی کی رعایت نہ کرتا '' ۷

سلطان بلبن نے خبر رسانی کے انتظام کو مضبوط و محکم بنانے کے لئے سنجیدہ اقدامات اٹھائے تھے اس کے دور حکومت میں کسی کو اتنی جرات نہ ہوتی تھی کہ بے وجہ کسی کے ساتھ ناانصافی کرے اس کے علاوہ وہ ہمیشہ اس بات کا بھی

خیال رکھتا تھا کہ کسی بھی برید کو اتنا بڑا علاقہ نہ دیا جائے کہ وہ ساری خبروں کا احاطہ کرنے سے عاجز ہو جائے یا خبر رسانی میں اس سے کسی قسم کی کوئی کوتاہی ہو جائے اسی لئے تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر الگ الگ برید مقرر کئے جاتے تھے۔

خلجی خاندان میں سلطان علاء الدین خلجی نے برید کے نظام کو اور زیادہ بہتر مضبوط بنایا اس بادشاہ نے خبر رسانی کے انتظام کو صحیح اور درست ڈھنگ سے چلانے کے لئے ڈاک چوکیاں بنوانے کا بھی خاص اہتمام کیا تھا ان ڈاک چوکیوں کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا تھا کہ خبریں جلد از جلد بادشاہ تک پہونچ جائیں تاریخ فیروز شاہی میں اس کی تفصیل اس طرح رقم کی گئی ہے۔

> ''جہاں جہاں تھانے چوکیاں قائم کرنا ممکن ہوتا وہ قائم کر دیتا ہر منزل پر الاغ (وہ ڈاک جو گھوڑوں کے ذریعے پہونچائی جاتی تھی) کے گھوڑے بندھوا دیئے جاتے اور تمام راستے پر آدھ کوس یا کوس کے ایک چھوٹے حصے پر دھاوے (دس افراد پر مشتمل گروہ جو ڈاک لے کر دوڑتا ہوا اگلی منزل تک پہونچتا تھا ''دھاوہ'' کہلاتا تھا) قائم کر دیئے جاتے راستے پر جن قصبوں اور گاؤں میں الاغ کے گھوڑے باندھے جاتے تھے وہاں عہدہ دار اور کیفیت نویس بھی متعین کر دیئے جاتے ہر روز یا دوسرے روز یا تیسرے روز یہاں اطلاع آجاتی کہ لشکر کیا کر رہا ہے''۸

کہتے ہیں کہ علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں محکمہ برید بہت مضبوط و مستحکم ہو گیا تھا محلوں، گلیوں حتیٰ کہ گھروں تک میں بھی خبر رساں موجود رہتے تھے اور رعایا کے تمام کارناموں کی خبر لمحوں میں بادشاہ تک پہونچا دیتے تھے جاسوسوں اور مخبروں کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ چکی تھی کہ دن کے وقت میں بھی لوگوں نے اس خوف سے آپس میں بات کرنا چھوڑ دیا تھا کہ کہیں اس کی خبر بادشاہ کو نہ ہو جائے اور اگر بادشاہ کو کسی طرح اس بات کی خبر پہونچ جاتی تھی کہ رعایا میں کوئی اس کے خلاف سازش کر رہا ہے یا بغاوت کی تیاری کر رہا ہے تو ایسے شخص کے لئے شدید سزا مقرر کی جاتی تھی۔

محمد بن تغلق نے اخبار رسانی کے نظام کو اپنے پیش روؤں سے زیادہ مستحکم اور تیز رفتار بنانے کے لئے خصوصی طور پر کارہائے گراں بہا انجام دیئے خبر رسانی کے سلسلے میں اس بادشاہ کا قابل ذکر کارنامہ یہ تھا کہ اس نے بڑے بڑے شہروں کے درمیان نقارہ خانوں کا ایک بڑا سلسلہ قائم کیا اگر کہیں سرحد پر کسی قسم کی کوئی بدنظمی پیدا ہو جاتی تو فوراً خطرے کا ڈنکا بجنے لگتا اور آناً فاناً بادشاہ کے پاس اس کی خبر پہونچ جاتی تھی کہ فلاں سرحد پر خطرہ ہے محمد بن تغلق کے دور حکومت میں محکمہ خبر رسانی کس قدر مضبوط اور تیز رفتار تھا اس کا اندازہ غیر ملکی سیاح ابن بطوطہ کی اس عبارت سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے اس عہد کے خبر رسانی کے سلسلے میں جناب امداد صابری نے مشہور و معروف سیاح ابن بطوطہ کے حوالے سے بہت قیمتی اور دلچسپ

معلومات بہم پہونچائی ہیں وہ لکھتے ہیں:

''سیوستان سے ملتان تک دس دن کا راستہ ہے اور ملتان سے دارالخلافہ دہلی تک پچاس دن کا جو خبر اخبار نویس بادشاہ کو لکھتے ہیں وہ اس کے پاس ڈاک سے پانچ دن میں پہونچ جاتی ہے ڈاک کو اس ملک میں برید کہتے ہیں، ڈاک دو قسم کی ہوتی ہے ایک برید انجیل گھوڑے کی دوسری برید الرجال پیادوں کی گھوڑے کی ڈاک کو اولاق کہتے ہیں ہر چار کوس کے بعد گھوڑا بدلتا ہے یہ گھوڑے بادشاہ کی طرف سے رہتے ہیں پیدلوں کی ڈاک کا یہ انتظام ہے کہ ایک میل میں جس کو کرہ کہتے ہیں چوکیاں ہرکاروں کی ہوتی ہیں اس چوکی کو وداہ کہتے ہیں ہر ایک تہائی میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے گاؤں کے باہر ہرکاروں کے لئے برجیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں ہر ایک برج میں ہرکارے کمر کسے بیٹھے رہتے ہیں ہر ایک کارے کے پاس ایک چھڑی دو گز لمبی ہوتی ہے جس کے سر پر تانبے کے گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں جب شہر سے ڈاک چلتی ہے تو وہ ایک ہاتھ میں لفافہ رکھ لیتا ہے دوسرے ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے تمام طاقت خرچ کر کے وہ دوڑتا ہے دوسرا ہرکارہ اس گھنگھرو کی آواز سن کر تیار ہو جاتا ہے اور لفافہ لے کر فوراً دوڑتا ہے اس طرح جہاں خط پہونچانا ہوتا ہے پہونچا دیتے ہیں''[۹]

شیر شاہ سوری نے بھی اپنے پیش رو ھندوستانی بادشاہوں کی طرح خبر رسانی کے نظام کو مضبوط بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا اس نے خبر رسانی کے نظام کو تیز تر بنانے کے لئے پورے ملک میں سڑکوں کا ایک جال سا پھیلا دیا اور ان سڑکوں کے کنارے سرائیں تعمیر کرائیں ان میں تھوڑی تھوڑی دوری پر ڈاک چوکی بھی ہوتی تھی ہر ڈاک چوکی میں ھمہ وقت دو گھوڑے تیار رہتے تھے اور فوراً خبر لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے شیر شاہ نے اپنی سلطنت میں کچھ جاسوسوں کو بھی مقرر کیا تھا تا کہ خبر رسانی کا سلسلہ زیادہ بہتر، تیز اور مضبوط بنایا جا سکے ان جاسوسوں کی تنخواہیں بہت زیادہ ہوتی تھیں اور اکثر یہ جاسوس دور دراز کے علاقوں کی خبریں بادشاہ تک پہونچایا کرتے تھے اگر بغیر کسی معقول سبب کے ان جاسوسوں کو خبریں پہنچانے میں دیر ہو جاتی یا کوئی کمی بیشی ہو جاتی تھی تو بادشاہ کی طرف سے ان کو سزا دی جاتی تھی۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم ھندوستان میں خبر رسانی کا انتظام ابتدائی زمانے سے ہی موجود رہا ہے ہر بادشاہ نے وقت، حالات اور ضرورت کے مطابق اس میں کمی وبیشی تو کی لیکن بنیادی ڈھانچہ اسی طرح قائم رہا قدیم ھندوستان میں تمام تر فاصلوں اور جدید ٹیکنالوجی سے محرومی کے باوجود بھی خبر رسانی کا یہ نظام اس قدر جامع اور مکمل تھا کہ حیرت زدہ رہ جانا پڑتا ہے ہندوستانی بادشاہوں نے خبر رسانی کی اہمیت وارزش کو اس حد تک محسوس کر لیا تھا کہ ہر ضلع میں ایک اخبار نویس

ضرور ہوتا تھا جو اپنے علاقے کی خبریں بادشاہ اور وزیروں کو بھیجا کرتا تھا چھاپہ خانہ کی ایجاد سے قبل خبر نگاری کا طریقہ زبانی و قلمی ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں تبدیلی آتی چلی گئی اور چھاپہ خانے قائم ہو جانے کے بعد فن صحافت نے جو عروج حاصل کیا وہ روز روشن کی طرح سب پر ہویدا ہے۔

ماخذ و منابع

۱۔ رہبر اخبار نویسی، سید اقبال قادری، ص ۱۶، ترقی اردو بیورو نئی دھلی۔

۲۔ اردو صحافت زبان، تکنیک، تناظر، مشتاق صدف، ص ۱۰، عفیف آفسیٹ پرنٹرس دہلی ۲۰۱۰ء۔

۳۔ تاریخ صحافت اردو جلد اول، امداد صابری، ص ۱۷۔۱۸، یونین پرنٹنگ پریس دھلی ۱۹۵۳ء۔

۴۔ ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، محمد عتیق صدیقی، ص ۲۳، انڈس پبلی کراچی ۱۹۸۰ء۔

۵۔ اردو دنیا، ڈاکٹر صالحہ رشید، ص ۱۹، دسمبر ۲۰۱۵ء۔

۶۔ عبدالماجد سالک مسلم ثقافت ھندوستان میں ص ۳۲۹ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔

۷۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی مترجم معین الحق، ص ۱۰۰، مرکزی اردو سائنس بورڈ لاھور ۱۹۸۳ء

۸۔ تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین، مترجم معین الحق، ۴۸۵ ص مرکزی اردو سائنس بورڈ لاہور ۱۹۸۳ء۔

۹۔ تاریخ صحافت اردو جلد اول، امداد صابری، ص ۲۶ یونین پرنٹنگ پریس دھلی ۱۹۵۳ء۔

☆☆☆

میراث خطی

عطاخورشید(ڈاکٹر)
مولانا آزادلائبریری،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

مولانا آزادلائبریری،علی گڑھ میں ابن سینا کے مخطوطات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری ''مولانا آزادلائبریری'' کے نام سے مشہور ہے۔اس لائبریری کا آغاز سرسیداحمد خاں (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کے اپنے ذخیرۂ کتب سے ۱۸۷۷ء میں ہوا تھا۔اس لائبریری کا سنگ بنیاد اُس وقت کے وائسرائے ہندلارڈلٹن (۱۸۷۶ء۔۱۸۸۰ء) نے رکھا تھا۔لہذا سرسید نے لارڈلٹن کے نام پر اس لائبریری کا نام ''لٹن لائبریری'' رکھا۔تقریباً ۸۳ برسوں تک یہی نام رائج رہا۔۶/دسمبر ۱۹۶۰ء میں جب یہ لائبریری اپنی موجودہ نئی تعمیر شدہ عمارت میں منتقل ہوئی تو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) کی یاد میں اس لائبریری کا نام بدل کر ''مولانا آزادلائبریری'' رکھ دیا گیا۔

سرسید کے عطیہ کے بعد آپ کے صاحبزادے سید محمود (۱۸۵۰ء۔۱۹۰۳ء) نے بھی اپنا ذخیرۂ کتب اِس لائبریری کو ہدیہ کردیا۔اسی ذخیرے میں ابن سینا (م ۴۲۸ھ/ ۱۰۳۶ھ) کی مشہور تصنیف ''القانون'' کی ابتدائی اشاعتوں میں سے ۱۵۹۳ء کا اشاعت شدہ نسخہ، جو روم (اٹلی) میں شائع ہوا تھا، بھی آیا جو آج بھی اِس لائبریری کی شان بڑھا رہا ہے۔سرسید اور سید محمود کے عطیات کے بعد اہل علم حضرات بھی اپنے ذخائر اس لائبریری کو ہدیہ کرنے لگے۔ان میں اولیت گورکھپور کے رئیس سید سبحان اللہ خاں (۱۸۸۶ء۔۱۹۴۱ء) کو حاصل ہے جنھوں نے اپنا قیمتی اور گراں قدر مخطوطات و مطبوعات پر مبنی ذخیرہ اس لائبریری کو ۱۹۳۷ء میں ہدیہ کردیا جو ''سبحان اللہ کلکشن'' کے نام سے موسوم ہے۔اب تک ایسے تیرہ ذخائر اس لائبریری کی زینت ہیں جو اپنے معطیان کے نام سے منسوب ہیں۔ان تمام ذخائر میں طبی مخطوطات کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ان ذخائر میں خالصتاً طبی مخطوطات پر مبنی ایک ذخیرہ، جو تقریباً ۴۰۰ عربی، فارسی و اردو مخطوطات پر مشتمل ہے، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ کا بھی ہے جو ۲۰۰۷ء میں مولانا آزادلائبریری میں منتقل کردیا گیا جو ''طبیہ کالج کلکشن'' کے نام سے موسوم ہے۔

مولانا آزادلائبریری میں تقریباً ایک ہزار سے زائد عربی، فارسی اور اردو زبان میں طبی مخطوطات موجود ہیں۔ ان میں ڈیڑھ سو سے زائد مخطوطات ابن سینا (م ۴۲۸ھ/ ۱۰۳۶ء) کے حوالے سے ہیں۔القانون اور اس کی شروح کی

تعداد بھی ایک صد کے قریب ہے۔ یہ مخطوطات آٹھویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی ہجری پر محیط ہیں۔

مولانا آزاد لائبریری میں جیسا کہ میں نے قبل عرض کیا کہ ابن سینا کی تصنیفات کے تقریباً ڈیڑھ سو نسخے موجود و محفوظ ہیں۔ یوں تو ابن سینا کی بیشتر تصنیفات دنیا کے کسی نہ کسی گوشے سے اصل صورت میں یا ترجمہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں، لیکن ان نسخوں کے طبع ہونے کے باوجود ان کے قلمی نسخوں کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ برقرار ہے۔ مثلاً ''القانون فی الطب'' کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں، لیکن دنیا کے بیشتر کتبخانوں میں اس کتاب کے قلمی نسخے موجود ہیں جو اس کتبخانے کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ القانون پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے کامل نسخے کم ملتے ہیں۔ زیادہ تر سبھی حصوں کو علاحدہ ایک کتاب تسلیم کر کے علاحدہ علاحدہ نسخوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ مولانا آزاد لائبریری میں القانون کے دو کامل نسخے ہیں۔ پہلا نسخہ طبیہ کالج کلکشن میں ہے (نمبر ۳۰۷)۔ یہ ۷۰۸/ اوراق پر مشتمل ہے۔ عربی نسخ میں تحریر کردہ نسخہ ہے۔ کاتب کا نام محمد بن فتح اللہ بن حاجی سعد الدین ہے۔ سنہ کتابت ۹۰۰ھ ہے۔ پہلا ورق مطلا و مذہب ہے۔

دوسرا مکمل نسخہ سبحان اللہ کلکشن میں ہے (ضمیمہ نمبر ۳۷/۶۱۰)۔ معمولی نستعلیق میں لکھا نسخہ ہے اور آب زدہ ہے۔

القانون کا ایک مکمل نسخہ حبیب گنج کلکشن میں ہے لیکن اس کے ہر باب کو علاحدہ کر کے علاحدہ علاحدہ مجلد اور اندراج کر دیا گیا ہے (نمبر ۲۳۔۱۹/۴۶)۔ سنہ کتابت ۱۸/ جلوس محمد شاہ ہے۔ ہر حصے کے صفحہ اول و آخر پر ایک مہر ''عبدہ فقیر نور الدین محمد القادری الانصاری المالک ھواللہ الباری ۱۲۳۸'' ثبت ہے۔ سرلوح مطلا و منقش ہے۔

القانون کے دو نسخے ایسے ہیں جو نصف اول اور نصف دوم حصص پر مشتمل ہیں یعنی پہلا حصہ کتاب الاول اور کتاب الثانی پر مشتمل ہے (یونیورسٹی کلکشن ضمیمہ طب نمبر ۱۰) جبکہ دوسرے حصے میں کتاب الثالث، کتاب الرابع اور کتاب الخامس رقم ہے (سبحان اللہ ضمیمہ نمبر ۳۶/۶۱۰)۔ دوسرا نسخہ نسخ خفی میں لکھا نسخہ ہے سنہ کتابت ۹۷۷ھ ہے۔ کاتب کا نام ابو طالب بن عنایت اللہ الطبیب ہے۔ اس طرح دونوں نسخے ملا کر یہ ایک کامل نسخہ کہلانے کا حقدار ہے۔

ان مکمل نسخوں کے علاوہ بھی ہر حصہ یعنی ہر کتاب علاحدہ علاحدہ صورت میں مجلد ہے۔ مولانا آزاد لائبریری میں القانون کی کتاب الاول کے آٹھ نسخے محفوظ ہیں۔ (حبیب گنج ۱۵/۴۶؛ حبیب گنج ۱۹/۴۶؛ سبحان اللہ ۱۸/۶۱۰؛ یونیورسٹی ضمیمہ طب نمبر ۸؛ یونیورسٹی ضمیمہ طب نمبر ۱۰؛ سلیمان ۱۶/۲۰۰؛ طبیہ ۱۷۵؛ طبیہ ۱۷۹)۔ ان آٹھوں نسخوں میں دو نسخے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اول نسخہ سبحان اللہ کلکشن میں ہے (نمبر ۱۸/۶۱۰)۔ شکستہ آمیز نستعلیق میں لکھا ہوا نسخہ ہے۔ ترقیمہ نہیں ہے لیکن سرورق پر ۱۳۰۶ھ کی ایک یادداشت مرقوم ہے ''این کتاب نوشتہ قلم جناب سید طفیل محمد اترولوی استاد جناب میر آزاد بلگرامی است و بعنایتہ تعالی رفتہ رفتہ بایں ہیچمداں ..... (نام مٹا دیا گیا ہے) المحمد الحسینی رسید''۔ دوسری یادداشت جو

اس سے قدیم ہے لیکن اسے بھی مٹانے کی کوشش کی گئی ہے ''.....کہ سید.....عطیہ بدلعلی بخشیدہ''۔اس عبارت کے نیچے ایک چھوٹی سی مدور مہر ''دل علی ۱۱۷۳'' ثبت ہے۔سرورق پر لکھی تحریر کی بنیاد پر ہی سبحان اللہ کلکشن کے کیٹلاگر نے بھی کاتب کا نام سید طفیل محمد اترولوی ہی لکھا ہے۔ مولانا آزاد لائبریری میں القانون کی کتاب الثانی کے پانچ نسخے موجود ہیں۔ان میں دو نسخوں پر سنہ کتابت موجود ہے۔تین نسخے بدون سنہ کتابت ہیں۔پہلا نسخہ یونیورسٹی کلکشن میں موجود ہے (ضمیمہ طب نمر ۹) جو ۳۶۴/اوراق پر مشتمل ہے۔نستعلیق میں تحریر ہے۔ترقیمہ میں کاتب کا نام مٹا دیا گیا ہے۔سنہ کتابت ۱۱۲۵ھ ہے۔ سرورق پر ایک مدور مہر ''بندہ درگاہ غلام شاہ'' ثبت ہے۔

مولانا آزاد لائبریری میں القانون کی کتاب الثالث کے تین نسخے موجود ہیں۔تینوں نسخے بدون سنہ کتابت ہیں۔

مولانا آزاد لائبریری میں القانون کی کتاب الرابع کے بھی تین نسخے موجود ہیں۔تینوں نسخے بدون سنہ کتابت ہیں۔

مولانا آزاد لائبریری میں القانون کی کتاب الخامس کے دو نسخے موجود ہیں۔دونوں نسخے بدون سنہ کتابت ہیں۔

''القانون فی الطب'' سے تعلق رکھنے والی دیگر تصنیفات مثلاً تلخیص، شرحیں وغیرہ کی بھی ایک بڑی تعداد مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے۔مثلاً ابن النفیس، عمادالدین محمود الشیرازی، حکیم علی الجیلانی، چغمینی وغیرہ۔ابن سینا کی ''القانون فی الطب'' کی طرح اس کی دوسری تصنیف ''کتاب الشفا'' نے بھی علمی دنیا میں کافی شہرت حاصل کی۔اس کے چار حصے یا ابواب ہیں جو 'کتب' کے عنوان سے ہیں اور ہر باب کئی کئی فن پر مشتمل ہے۔

''القانون'' کی طرح ''کتاب الشفا'' کو بھی کاتبین نے علاحدہ علاحدہ نقل کر کے اسے انفرادی نسخے کی طرح استعمال کیا۔چنانچہ مولانا آزاد لائبریری میں بھی ''کتاب الشفا'' کا ہر باب علاحدہ کتاب کی صورت میں موجود ہے۔ان انفرادی نسخوں کے علاوہ ''کتاب الشفا'' کے چار کامل نسخے بھی اس لائبریری میں موجود ہیں (سبحان اللہ ۳۰/۱۱۰؛ سبحان اللہ ۸۴/۱۶۰؛ سبحان اللہ ۲۱/۱۶۰ اور یونیورسٹی علوم ۵۵)۔

پہلا نسخہ جو سبحان اللہ کلکشن میں ہے (نمبر ۳۰/۱۱۰) عربی نسخ میں لکھا مجدول نسخہ ہے۔جداول طلائی ہیں۔ کاتب کا نام محمد حسن المشہدی ابن محمد حاجی علی ہے جس نے اس کی کتابت ۱۰۷۱ھ میں کی ہے۔اوراق کی تعداد ۵۸۹ ہے۔ سرورق پر مظفر جنگ خانہ زاد محمد شاہ بادشاہ غازی کی دو مہریں ثبت ہیں جنہیں مٹانے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کے علاوہ بھی کئی محکوک مہریں ہیں۔۱۱۹۲ اور ۱۱۹۵ھ کے دو عرض دیدے بھی ہیں۔

''کتاب الشفا'' کا دوسرا مکمل نسخہ ۳۶۲/اوراق پر مشتمل ہے (سبحان اللہ ۸۴/۱۶۰)۔۱۱۲۹ھ کا مکتوبہ ہے۔غالباً کسی فروخت کنندہ نے نہایت ہی کمال چابکدستی سے ۱۱۲۹ کے گیارہ کے ہندسے کو سات کے ہندسے میں بدل دیا جو پہلی نظر میں ۱۱۲۹ کی بجائے ۷۲۹ پڑھا جاتا ہے، لیکن جعل کرنے والے کی نظر سے یہ بات چوک گئی کہ کاتب نے یہ سنہ صرف

عدد میں نہیں بلکہ حروف میں بھی لکھا ہے ''سنہ تسع وعشرین والف مایۃ''۔

''کتاب الشفا'' کا تیسرا مکمل نسخہ بھی سبحان اللہ کلکشن میں ہے (نمبر۲۱/۱۶۰)۔۳۸۵/اوراق پر مشتمل یہ نسخہ خط نسخ میں لکھا ہے۔

''کتاب الشفا'' کا چوتھا مکمل نسخہ یونیورسٹی کلکشن (عربیہ علوم نمبر۵۵) میں ہے۔۲۹۶/اوراق پر مشتمل باریک نستعلیق خط میں لکھا نسخہ ہے۔۱۳۱۳ھ میں محمد محسن ابن شیخ محمد گدا حسین چریا کوٹی ثم گورکھپوری نے اسے نقل کیا ہے۔

''کتاب الشفا'' کا ایک پانچواں مکمل نسخہ بھی سبحان اللہ کلکشن میں ہے (نمبر۲۴/۱۱۰؛ضمیمہ۱۴/۵۲۰؛اور۵۳/۱۱۰) جسے چار حصوں میں علاحدہ علاحدہ مجلد واندراج کر دیا گیا ہے۔چونکہ کاتب نے تسلسل کے ساتھ ورق نمبر دے رکھے ہیں اسی لیے تینوں حصوں کو مربوط کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔پہلا حصہ جو ورق نمبر ا سے ۳۸۵ تک ہوگا اس کلکشن میں نہیں ہے۔۳۸۶ سے ۶۵۱ تک دوسرا حصہ ہے (سبحان اللہ ۲۴/۱۱۰)۔تیسرا حصہ ورق نمبر۶۵۲ سے ۷۸۲ تک ہے (سبحان اللہ ضمیمہ۱۴/۵۲۰)۔خط نسخ میں لکھا یہ ایک پاکیزہ نسخہ ہے۔کاتب نے اشکال بنانے کی غرض سے بیشتر جگہوں پر خالی جگہ چھوڑ دی ہے جسے پورا نہیں کیا جا سکا۔غیر مجدول نسخہ ہے۔چونکہ تسلسل میں لکھا نسخہ ہے اس لیے پہلے صفحے پر پچھلے نسخے کی آخری عبارت درج ہے۔اس کا چوتھا اور آخری حصہ ورق نمبر۷۸۳ سے شروع ہوکر۹۶۲ پر ختم ہوتا ہے۔اس طرح یہ ایک کامل نسخہ ہے۔

''کتاب الشفا'' کا ایک کامل (لیکن ناقص الآخر) نسخہ طبیہ کالج کالج کلکشن میں ہے (نمبر۳۵۴)۔خط نسخ میں لکھا یہ نسخہ ۲۴۸/اوراق پر مشتمل ہے۔ناقص الآخر ہونے کے سبب ترقیمہ نہیں ہے۔سنہ کتابت کا پتا نہیں چل سکا لیکن سرورق پر ایک مخلوک مہر ہے جس کا صرف سنہ ۱۰۵۹ پڑھنے میں آتا ہے۔اس سے یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ نسخہ ۱۰۵۹ھ سے قبل وجود میں آیا ہے۔سرورق پر ہی نوابین اودھ کی درج ذیل تین مہریں ثبت ہیں:

۱۔ خوش است مہر کتب خانہ سلیمان جاہ
بہر کتاب مزیّن چو نقش بسم اللہ

۲۔ ناسخ ہر مہر شد چوں شد مزیّن بر کتاب
خاتم امجد علی شاہ زمان عالی جناب

۳۔ خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب
ثابت و پُر نور باد تا فروغ آفتاب

''کتاب الشفا'' کا ایک نسخہ یونیورسٹی کلکشن (عربیہ علوم نمبر۳) میں ہے جو اس کے تیرھویں فن پر مشتمل ہے۔

خوشخط نستعلیق میں سنہرے وسرخ حوضے کے اندر ۲۴ راوراق پر لکھا یہ نسخہ کبھی والیان اودھ کے کتبخانے کی زینت رہا ہے۔ چنانچہ پہلے اور آخری صفحات پر اِن کی مہریں ثبت ہیں۔

ان کامل نسخوں کے علاوہ ہر باب یا ہر فن کو علاحدہ علاحدہ نقل کر کے بھی ایک علاحدہ نسخہ تیار کیا گیا ہے۔ ایسے نسخوں کی تعداد تقریباً بیس ہے۔ ابن سینا نے ''کتاب الشفا'' کی ایک تلخیص بھی تیار کی تھی جو ''تعلیق الشفا'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ایک نسخہ حبیب گنج کلکشن میں ہے (نمبر ۱۱/ ۳۹)۔ یہ ۱۱۳ راوراق پر مشتمل ہے۔ اس کے کاتب علی نقی بن نورالدین محمد نے ۱۲۶۶ھ میں اسے نقل کیا۔ معمولی نستعلیق میں لکھا یہ نسخہ ہے۔ اس کتاب کا دوسرا نسخہ بھی حبیب گنج کلکشن میں ہی (نمبر ۲/ ۳۹) ہے جو خط نستعلیق میں لکھا ۵۰ راوراق پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ بدون سنہ کتابت ہے۔

مذکورہ بالا مشہور ومعروف تصنیفات کے علاوہ ابن سینا کی کئی اور دیگر تصنیفات/ رسالوں کے قلمی نسخے بھی اس لائبریری میں موجود ہیں۔ مثلاً:

''دفع المضار الكليه عن الابدان الانسانية ''(یونیورسٹی عربیہ علوم نمبر ۴۱)۔ ۵۱ راوراق پر مشتمل اس نسخے کے کاتب امیر خاں ہیں جنہوں نے ۱۲۲۸ھ میں اسے نقل کیا ہے۔ اس میں انسانی ابدان کے امراض کو دور کرنے کے لیے تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

''کنوز المغرمین ''(حبیب گنج ۱/ ۹۵)۔ طلسمات وعملیات پر مشتمل یہ نسخہ ۲۳ راوراق پر مشتمل ہے۔

''تفسیر سورة ثلاثة ''۔ یہ سورۃ اخلاص، سورۃ فلق اور سورۃ والناس کی مختصر تفسیر ہے۔ اس کے دو نسخے اس لائبریری میں ہیں۔ دونوں بدون سنہ کتابت ہیں۔ پہلا نسخہ عبدالحیی کلکشن (نمبر ۲۴/ ۲۵) میں ہے جو ۷ راوراق پر مشتمل ہے۔ دوسرا نسخہ یونیورسٹی کلکشن (عربیہ علوم نمبر ۹/ ۳۲) میں ہے جو ۶ راوراق پر مشتمل ہے۔

''الرسالة النيروزية فى معانى الحروف الهجائية و فواتح عدة السور الفرقانية''۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس میں قرآنی حروف بالخصوص حروف مقطعات کی فلسفیانہ توجیح پیش کی گئی ہے۔ اس کے تین نسخے مولانا آزاد لائبریری میں ہیں۔ اول حبیب گنج کلکشن (نمبر ۵۱/ ۵) میں، دوم عبدالحیی کلکشن (نمبر ۳۹/ ۳۷) میں اور تیسرا یونیورسٹی کلکشن (عربیہ علوم نمبر ۱۶/ ۳۲) میں ہے۔

یونیورسٹی کلکشن میں ۲۴ عربی رسائل پر مشتمل ایک مجموعہ ہے (عربیہ علوم نمبر ۳۲)۔ اس مجموعے کے کاتب عبدالقادر اردبادی ہیں سنہ کتابت ۱۰۲۴ھ ہے۔ اس مجموعے میں ابن سینا کے درج ذیل ۱۴ رسائل تحریر ہیں:

۱۔ رسالة فى كيفية سِريان العشق فى الموجودات ۔ ۱۳ ق (نمبر ۳ / ۳۲)

۲۔ مناجات فى الاعتذار عَن شَربِ الخُمر ۔ ۱ ق (نمبر ۴ / ۳۲)

۳۔ رسالة العرشية فی العلم الالہی ۔ ۱۳ ق (نمبر ۵ / ۳۲)

۴۔ رسالةفی السعادة والحِجَج العشرة علی اِنّ النفسِ الانسانية جوهر و اِنّها لا يَقبِلُ الفَساد و فی استمدادها مِن الفيض الالہی و فی اَنَّ الاجرام العلويه ذواتِ النفس ناطقة و فی احوالها عِندَ مَفارِقها۔ ۱۵ ق (نمبر ۶ / ۳۲)

۵ ۔ رسالة الاضحوية فی حال المَعاد والآرا فيه ۔ ۲۵ ق (نمبر ۷ / ۳۲)

۶ ۔ رسالة فی سعادة النفوسِ الناطقه فی النشأة الآخرة من کتاب المبداء والمَعاد۔ ۵ ق (نمبر ۸ / ۳۲)

۷ ۔ رسالة تفسير ثلاثة ۔ ۶ ق (نمبر۹ / ۳۲)

۸ ۔ رسالة العروس ۔ ۳ ق (نمبر۱۵ / ۳۲)

۹ ۔ رسالة النيروزية ۔ ۴ ق (نمبر ۱۶ / ۳۲)

۱۰ ۔ رسالة فی اثبات النبوة ۔ ۱۱ ق (نمبر ۱۷ / ۳۲)

۱۱ ۔ رسالة فی الادلة المحققة لبقاءِ النفسِ الناطقة ۔ ۷ ق (نمبر ۱۸ / ۳۲)

۱۲ ۔ رسالة فی التعريف الرای المحصّل الذی حُتِمَت عَليه رَوِية الاقدمين فی جوهرِ الاجسام السمٰوية والعبارة عَن مَذهَبِهِم المحقق عِندَه بِمقدار اِطلاعه عَلی مَا خَذِهِم ۔ ۱۰ ق (نمبر ۱۹ / ۳۲)

۱۳ ۔ رسالة کَتَبَهَا الشيخ الرئيس الی الکيا ابی جعفر۔ ۳ ق (نمبر ۲۰ / ۳۲)

۱۴ ۔ رسالة کَتَبَهَا الشيخ الرئيس الی تلميذه ابی عبيد الجوزجانی۔ ۴ ق (نمبر ۲۱ / ۳۲)

مولانا آزاد لائبریری کے عبدالحیی کلکشن میں شیخ الرئیس ابن سینا کے حالات پر لکھا ایک رسالہ ہے جو خفی نسخ میں ۵/اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ ایک مجموعہ میں شامل ہے جس میں کئی اور دیگر عربی کے رسالے شامل ہیں۔ اس مجموعے کے کاتب محمد سعید ہیں اور سنہ کتابت ۱۰۱۲ھ ہے۔ اس رسالے میں ابن سینا کے حالات کے ذیل میں اس کی تصنیفات کے عنوانات لکھے ہیں جن کی تعداد ۱۴۰ ہے۔ ابن سینا کی تالیفات کے قلمی نسخے پوری دنیا کے کتبخانوں میں بکھرے پڑے ہیں ۔ ان تصنیفات کی ایک بڑی تعداد ہندوستان کے کتبخانوں میں موجود ہے اور ہماری خوش نصیبی ہے کہ اِن قلمی کتابوں کا ایک بڑا حصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں موجود ہے۔

☆☆☆

دکنیات

نکہت فاطمہ (ڈاکٹر)
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، مانو لکھنؤ کیمپس لکھنؤ

بہمنی دور میں فارسی زبان وادب: ایک اجمالی جائزہ

سلطان محمود غزنوی (حکومت: ۳۸۹۔۴۲۱ھ/ ۹۹۹۔۱۰۳۰ء) کی سرپرستی میں تقریباً گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں فارسی زبان نے ہندوستان میں قدم رکھا اور ترویج و پیشرفت کے مدارج طے کرنے لگی۔ لاہور فارسی زبان و ادب کا مرکز بن گیا۔ محمود کے جانشینوں نے بھی فارسی زبان کی سرپرستی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور شعرا، علما وفضلا اور ادبا کی دل کھول کر تشویق کی۔ دہلی سلاطین کے علاوہ صوبائی حکومتوں نے بھی فارسی زبان و ادب کی پیشرفت میں حصّہ لیا۔ چودھویں صدی عیسوی تک دہلی سلطنت وسیع ہو کر دکن تک پہنچ گئی تھی۔ سلطنت کی وسعت کے سبب سلطان محمد بن تغلق (حکومت: ۷۲۵۔۷۵۲ھ/ ۱۳۲۵۔۱۳۵۱ء) کو دہلی سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا، اس وجہ سے اس نے اپنا دارالحکومت دہلی سے دکن میں دیوگیر (دولت آباد) منتقل کر دیا۔ دہلی کی آبادی کے ساتھ ساتھ امرا اور شرفا بھی دکن منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ حکمرانی اور نظم ونسق کی غرض سے امیران صدہ مامور کیے گئے۔ کچھ عرصے بعد سلطان کی مطلق العنانی کے خلاف انہوں نے خودمختاری کے حصول کے لیے جدوجہد شروع کی اور ۷۴۶ھ/ ۱۳۴۵ء میں امیر اسمٰعیل کی قیادت میں دہلی سلطنت سے بغاوت کر کے اپنی خودمختار سلطنت قائم کر لی۔ امیر اسمٰعیل نے ناصرالدین شاہ کا لقب اختیار کر کے دکن کی حکومت سنبھالی۔ کچھ عرصہ بعد ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء میں امیران صدہ نے ظفر خان کو اپنا بادشاہ بنا لیا جس نے علاؤالدین حسن بہمنی شاہ کے لقب سے دکن میں بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

بہمنی خاندان میں کل اٹھارہ بادشاہ ہوئے اور یہ خاندان ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء سے ۹۳۴ھ/ ۱۵۲۷ء تک جنوبی ہند (دکن) پر حکمران رہا۔ علاؤالدّین حسن شاہ گانگو بہمنی (حکومت: ۷۴۸۔۷۵۹ھ/ ۱۳۴۷۔۱۳۵۸ء) کے دور سے لے کر آخر کے کم وبیش سبھی بادشاہوں نے تہذیبی، ادبی اور علمی سرپرستی میں حصہ لیا۔

علاؤالدّین حسن بہمنی: علاؤالدّین حسن گانگو بہمنی نے بہمنی خاندان کی بنیاد ڈالی اور احسن آباد گلبرگہ کو دارالحکومت بنایا۔ وہ علما وفضلا کی بہت مدد کرتا تھا۔ متعدد علما اس کی مصاحبت میں رہتے تھے۔ مثلاً مولانا لطف اللہ سبزواری، ملّا معین الدّین ہروی،

مفتی احمد ہروی، ملاّ محمد اسحٰق سرہندی، ملاّ فضل اللہ انجوی شیرازی، ملاّ حکیم علیم الدّین تبریزی، حکیم نصیر الدّین شیرازی، صدر الشریف سمرقندی، ملک رکن الدین غوری، ملک سیف الدّین غوری، سید رضی الدّین جگا جوت وغیرہ (۱)۔ جب علاؤالدّین بادشاہ ہوا تو اس نے سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ شیخ برہان الدّین کو جو اپنے پیر و مرشد سلطان المشائخ شیخ نظام الدّین اولیا کی اجازت سے دکن کو چار سو درویش لے کر آئے تھے اور دولت آباد میں رہتے تھے، پانچ سو من سونا اور دس من چاندی دیا جائے تاکہ وہ شیخ المشائخ کے نام پر فقرا کو خیرات کر سکیں (۲)۔ بہمنی سلطنت کے وکیل السلطنت ملک سیف الدّین غوری نے حسن گانگو بہمنی کو ایک رسالہ بنام ''نصائح الملوک'' جو کہ آداب شاہی اور قوانین ملک کشائی سے متعلق تھا، لکھ کر دیا۔ حسن گانگو بہمنی اس رسالے کے مطالعے سے بہت محظوظ ہوا اور ان نصائح پر کاربند رہا۔ حسن گانگو بہمنی فارسی زبان اچھی طرح جانتا تھا اور اس نے شاہزادوں کی تعلیم و تربیت کا بھی عمدہ اہتمام کیا تھا اور مولانا فضل اللہ انجو شیرازی کو شاہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے فائز کیا۔ بقول فرشتہ درسی کتابوں میں بوستان سعدی شامل تھی۔ فرشتہ ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ ایک روز حسن نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے محمود کو بلا کر پوچھا کہ استاد سے کیا پڑھتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: ''بوستان سعدی''۔ سلطان نے پوچھا کہ آج کا سبق کیا ہے؟ شہزادے نے جواب دیا کہ یہ حکایت پڑھی ہے:

شنیدم کہ جمشید فرخ سرشت — بہ سر چشمہ ای بر بہ سنگی نبشت
بر این چشمہ چون ما بسی دم زدند — برفتند چون چشم برہم زدند
گرفتند عالم بہ مردی و زور — ولیکن نبردند با خود بہ گور (۳)

حسن گانگو بہمنی نے مدارس بھی کھولے اور طلبہ و اساتذہ کے لیے وظائف مقرر کیے۔ ۷۵۰ھ/ ۱۳۴۹ء میں صفدر خان سیستانی نے اس کے حکم سے صوبہ برار ایلچپور میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ مدرسہ میں مولانا محمد ابراہیم سندھی، مولانا محمد یحیٰ سندھی مقرر کیے گئے۔

محمد شاہ اوّل بن سلطان علاؤالدّین حسن گانگو بہمنی (حکومت: ۷۵۹۔۷۷۶ھ/ ۱۳۵۸۔۱۳۷۵ء): محمد شاہ اوّل اہل علم کی صحبت پسند کرتا تھا۔ شیخ زین الدّین دولت آبادی، شیخ عین الدّین بیجاپوری، مولانا نظام الدّین برنی، حکیم ظہیر الدّین تبریزی جیسے اہل علم اس کی دار السلطنت میں موجود تھے۔ جس سے دکن اہل علم کا گہوارہ اور سارے ہندوستان کے لیے قابل رشک بن گیا تھا۔ محمد شاہ حضرت شیخ محمد سراج جنیدی کا معتقد اور مرید تھا۔ یہ بادشاہ اپنے والد کی طرح علما و شعرا کی بہت قدر کرتا تھا۔ عبدالجبار خان محبوب الوطن تذکرہ سلاطین دکن میں بحوالہ 'مفرح القلوب' لکھتے ہیں کہ ایک بار شعرا میں سے کسی شاعر نے ایک قصیدہ اس بادشاہ کی تعریف میں پیش کیا۔ بادشاہ بہت خوش ہو۔ حکم دیا کہ شاعر کو خزانہ شاہی لے جاؤ اور جس قدر وہ اٹھا سکے لینے دو (۴)۔

مجاہد شاہ بن محمد شاہ اوّل بہمنی (حکومت: ۷۷۶-۷۷۹ھ/ ۱۳۷۵-۱۳۷۸ء): تذکرہ سلاطین دکن میں ملحقات طبقات ناصری کے حوالے سے لکھا ہے کہ محمد شاہ بہمنی نے شاہزادہ مجاہد کی تعلیم و تربیت کا عمدہ اہتمام کیا ہوا تھا۔ لائق اساتذہ اور اتالیق مقرر کیے تھے۔ ابتدا میں فارسی و ترکی زبان سے آشنائی حاصل کرائی۔ جب مفردات، الفاظ، مرکبات اور فقرات ازبر کر چکا، تب چند اہل فارس اور اہل ترک شاہزادے کی خدمت میں مقرر کیے اور تاکید کی کہ وقتاً فوقتاً شاہزادے سے فارسی و ترکی زبان میں گفتگو کرتے رہیں۔ حسب الحکم اساتذہ و اتالیق مذکورہ زبانوں میں مکالمہ کرتے تھے۔ شاہزادہ چند روز کی مشق میں فارسی و ترکی میں بے تکلف اہل زبان کی طرح مکالمہ کرتا تھا۔ غرض شاہزادے نے فارسی و ترکی زبان میں ایسی مہارت کاملہ حاصل کر لی تھی کہ دونوں زبانوں میں بامحاورہ عبارت میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا اور علوم و فنون میں اگرچہ عالم و فاضل نہیں تھا، لیکن بقدر ضرورت کتب درسیہ میں تعلیم پائی تھی۔ وہ علم دوست بھی تھا اور اپنے باپ دادا کی طرح علما و فضلا کی قدر کرتا تھا(۵)۔ فرشتہ لکھتا ہے: ''بہ زبان ترکی نیکومی گفت و مدار مجالست و مصاحبت او با ترکان و فارسی زبانان بود۔''(۶)

محمد شاہ دوّم (۷) بن محمود خان (حکومت: ۷۸۰-۷۹۹ھ/ ۱۳۷۸-۱۳۹۷ء): بہمنی دور کا یہ پانچواں بادشاہ عربی اور فارسی کا عالم تھا اور اپنے عہد کے تمام مروجہ علوم پر دستگاہ رکھتا تھا۔ ہمیشہ علما و فضلا کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا اور ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس کے عہد میں عرب و عجم کے نہایت مشہور شعرا دکن آتے تھے۔ یہ انہیں انعام و اکرام سے نوازتا تھا اور لوگ مالا مال ہو کر اپنے وطن واپس جاتے تھے۔ ایک بار عجم کا ایک شاعر دکن آیا۔ اس نے محمد شاہ کے دربار میں آ کر ایک قصیدہ اس کی مدح میں پڑھا۔ بادشاہ نے اسے ایک ہزار تولہ سونے کے برابر رقم کا ایک سونے کا تنگہ دیا(۸)۔ بادشاہ کی سخاوت اور شہرت عالمگیر ہوئی۔ اکثر علما و شعرا دور دراز ممالک سے بادشاہ کے پاس آنے لگے۔ حضرت خواجہ شمس الدّین حافظ شیرازی بھی دکن کے سفر پر آمادہ ہوئے لیکن خواجہ کی راہ میں کچھ ایسی باتیں مانع ہوئیں کہ وہ روانہ نہ ہو سکے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر میر فضل اللہ انجو شیرازی (۹) نے خواجہ صاحب کے لیے سفر خرچ روانہ کیا اور عرض کیا کہ دکن تشریف لا کر یہاں کے باشندوں کو اپنے روحانی فیض اور شرف ملاقات سے خوش کریں۔ حضرت خواجہ بہت اشتیاق سے سفر دکن کی طرف مائل ہوئے اور دکن سے آئے ہوئے روپیوں میں سے کچھ تو اپنے بھانجوں اور بیوہ عورتوں کی مدد میں خرچ کیا اور کچھ اپنے قرض کو ادا کرنے میں صرف کیا۔ باقی روپیے سے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پھر سفر ہند کا سامان فراہم کر کے شیراز سے لار کے مقام پر پہنچے۔ باقیماندہ رقم ایک نادار دوست کو دے دی اور خود بالکل خالی ہاتھ رہ گئے۔ خواجہ زین العابدین ہمدانی اور خواجہ محمد گازرونی، جو اپنے عہد کے بہت مشہور تاجر تھے اور خواجہ صاحب کے ہمراہ سفر کر رہے تھے، خواجہ حافظ کے تمام اخراجات کی کفالت کے ذمہ دار ہوئے اور آپ کو لار سے بندر ہرمز لائے۔ یہاں پہنچ کر خواجہ صاحب ہمدانی اور گازرونی

کی لاپرواہیوں سے کچھ آزردہ ہو گئے لیکن پھر بھی کشتی پر سوار ہو کر دکن کا عزم کیا۔ ابھی کشتی چلی بھی نہ تھی کہ ہوا کا طوفان اٹھا اور دریا میں تلاطم بپا ہو گیا۔ خواجہ صاحب کا دل سفر سے بالکل بیزار ہو گیا اور یہ بہانہ کر کے کہ ہرمز میں چند دوستوں سے مل کر ابھی آتا ہوں، وہاں سے چلے آئے اور پھر شیراز واپس چلے گئے۔ ایک غزل لکھ کر میر فضل اللہ انجو کے پاس روانہ کی:

دمی با غم بہ سر بردن جہان یکسر نمی ارزد — بہ می بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد
بکوی می فروشانش بجامی بر نمی گیرند — زہی سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جان درو در جست — کلاہی دلکش است اما بہ تبرک سر نمی ارزد

میر فضل اللہ نے موقع تلاش کر کے خواجہ حافظ کا ہرمز تک آنا اور اس طرح واپس چلے جانا سلطان محمد سے بیان کیا۔ محمد شاہ نے جواب دیا کہ جو شخص عازم دکن ہو چکا ہو اور ہرمز تک کا سفر طے کر چکا ہو وہ ہمارے انعام و اکرام اور تحفہ و تحائف کا حقدار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے ملاّ محمد قاسم مشہدی کو جو بہمنی دور کا عالم و فاضل شخص تھا، ایک ہزر تنکہ طلائی عنایت کیے اور حکم دیا کہ اس سے ہندوستان کے بیش بہا عطیات خرید کر خواجہ حافظ کے لیے شیراز لے کر جائیں (۱۰)۔ محمد شاہ خود بھی اشعار کہتا تھا۔ یہ اشعار اس کی یادگار ہیں:

آنجا کہ لطف دوست دہد منصب مراد — بخت سیاہ و طالع میمون برابر است
عافیت در سینہ کار خون فاسد می کند — رخصتی ای دل کہ از الماس نشتر می خرم
خضر بد سوداست در بیع متاع عافیت — می روم این جنس را از جای دیگر می خرم (۱۱)

محمد شاہ یتیموں اور مساکین کی سرپرستی کرتا تھا اور یتیموں کی تعلیم کا خاص اہتمام کرتا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے مختلف شہروں اور قصبوں جیسے گلبرگہ، بیدر، قندھار، ایلچپور، دولت آباد وغیرہ میں مدارس قائم کیے اور معلم مقرر کیے جن کی تنخواہیں شاہی خزانے سے دی جاتی تھیں۔ محدثین کی بہت عزت افزائی کی جاتی تھی اور ان لوگوں کے لیے وظیفے مقرر کیے جاتے تھے۔

تاج الدّین فیروز شاہ بن احمد خان (حکومت: ۸۰۰۔۸۲۵ھ/ ۱۳۹۷۔۱۴۲۲ء): فیروز شاہ بہمنی فن و کمال کا بہت قدر دان تھا اور خود کہا کرتا تھا کہ ہر ملک کا سب سے بہترین اور اعلیٰ تحفہ اس ملک کے ماہر کمال و فن اشخاص ہیں وہ ہر ملک کے اہم باکمال لوگوں کو اپنے دربار میں جمع کرنا چاہتا تھا اور یہی سبب تھا کہ ساری دنیا کے اہل کمال اس کے دربار میں حاضر ہو کر انعام و اکرام سے مالا مال ہوتے تھے۔ بادشاہ لسانیات کا ماہر تھا اور ہر ملک کے باشندے سے اسی کے ملک کی زبان میں بات چیت کر سکتا تھا۔ فرشتہ کے مطابق اس کے حرم میں مختلف اقوام کی بیگمات تھیں جو عرب، ترکستان، فرنگستان، افغانستان، راجپوتانہ، بنگال، گجرات، تلنگانہ، مہاراشٹر سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہر بیگم کے پاس اس ملک اور وطن کی ہمزبان

کنیزیں موجود تھیں۔ بادشاہ ان بیگمات سے ان کی ہی زبان میں گفتگو کرتا تھا (۱۲)۔ فیروز شاہ بہمنی کا حافظہ غضب کا تھا۔ جو بات ایک بار سن لیتا اس کو کبھی نہیں بھولتا تھا۔ مستند شعراء کے اشعار اس کو زبانی یاد رہتے تھے۔ خود بھی شعر کہتا تھا اور کبھی عروضی اور کبھی عروجی تخلص کرتا تھا۔ صاحب دیوان شاعر تھا، لیکن دیوان اب نادرالوجود ہے۔ مختلف تذکروں میں اشعار ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: غزل کے چند اشعار:

بداں مثابہ زغم دہر بر دلم تنگ است — کہ دل بہ لذت سودائے عشق در جنگ است
گل امید شگفت از نسیم وعدہ دلی — ز آفتاب غم انتظار بے رنگ است
بہ قطع راہ محبت مخور فریب امید — کہ غایت ابدش ابتدائے فرسنگ است
کرشمہ جنبش آموزست مژگان درازش را ☆ ستم کردست واجب بر زبان تعلیم نازش را
عروجی قامت ورخسار آن خورشید تاباں را ☆ بہ سرو لالہ می سنجد بہ بیند امتیازش را
در آتش ہرزہ فکر زائل نکنی ☆ اندیشہ بہر خیال مائل نکنی
ایں نقد خزینۂ دماغ است بگوش — تا صرف بہ جنس ہای باطل نکنی

فیروز شاہ کو تمام علوم سے دلچسپی تھی خاص طور پر تفسیر، اصول حکمت سے شغف تھا اور ان علوم میں اس کو دستگاہ بھی حاصل تھی۔ علم طبیعیات اور الٰہیات میں علاّمۂ عصر تھا۔ صوفیائے اکرام کی اصطلاحات سے بھی واقف تھا۔ ہفتہ میں تین روز طالب علموں کو خود درس دیتا تھا۔ روز شنبہ تفسیر زاہدی ومطول، روز دوشنبہ ریاضی و ہندسہ میں شرح تذکرہ وتحریر اقلیدس اور روز چہار شنبہ کلام میں شرح مقاصد پڑھاتا تھا۔ طلبا کو پڑھانے کا وقت اگر دن میں نہ ملتا تو رات میں پڑھاتا تھا۔ خوش تقریر اور خوش بیان تھا۔ طلبا کو خوب سمجھاتا تھا۔ اگر کسی طالب علم کو کسی مسئلہ پر اعتراض ہوتا تو اس کو تسلّی بخش جواب دیتا (۱۳)۔ بقول فرشتہ اس بادشاہ کا مرتبہ علم ودانش میں محمد تغلق سے کہیں زیادہ تھا (۱۴)۔ اسی بادشاہ کے دور میں حضرت محمد گیسو دراز دہلی سے دکن تشریف لائے اور دکن کو رشد وہدایت اور تصنیف وتألیف کا ذریعہ بنایا۔ ملاّ داؤد بیدری نے اپنی کتاب 'تحفۃ السلاطین' اسی بادشاہ کے نام معنون کی۔

شہاب الدّین احمد شاہ بن احمد خان (حکومت: ۸۲۵۔۸۳۸ھ/۱۴۲۲۔۱۴۳۶ء): احمد شاہ علما وفضلا، سادات ومشائخین کا بے حد معتقد اور خود ولی صفت انسان تھا۔ فرشتہ ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ ایک سال بیدر میں بارش کی قلّت کی وجہ سے ایسا سخت قحط پڑا کہ تمام تالاب نہریں اور کنوئیں سوکھ گئے اور اکثر مواشی وجنگلی درندے پانی کی کمی کی وجہ سے مر گئے۔ بادشاہ نے خزانے اور غلّہ شاہی کا منہ کھول دیا اور غربا ومساکین میں تقسیم کر دیا۔ لیکن دوسرے سال بھی یہی صورت حال جاری رہی۔ احمد شاہ نے علما ومشائخ کو نماز استسقا کے لیے کہا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ عوام نے بادشاہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور اس

سلطنت کو منحوس سمجھنے لگے۔ بادشاہ نے ان باتوں سے رنجیدہ ہو کر ایک روز پہاڑ پر ایک بلند ٹیلہ پر چڑھ کر چند رکعت نماز ادا کی اور سجدہ میں سر رکھ کر نہایت عاجزی کے ساتھ دعا کی۔ اسی وقت بارش شروع ہوگئی۔ بادشاہ نہایت خوش ہوا اور کہا کہ میں فیض سبحانی سے نہیں بھاگتا ہوں۔ اس کے تمام کپڑے پانی سے بھیگ گئے۔ لوگ بارش اور ہوا کی شدّت سے گھبرا گئے اور اس سے چلنے کی درخواست کی اور کہا کہ اے احمد شاہ ولی! تیری ولایت معلوم ہوگئی۔ اب رعایا کے آرام کی خاطر شہر کی طرف مراجعت کر (۱۵)۔ احمد شاہ کو حضرت خواجہ گیسو دراز کی ذات بابرکت سے گہری عقیدت تھی۔ اس نے حضرت خواجہ کے لیے خانقاہ بنوائی اور اکثر اوقات ان کی خدمت میں جاتا اور صوفیا کے کلام سے مستفید ہوتا۔ اکثر محفل سماع میں بھی حاضر ہوتا تھا اور خانقاہ کے درویشوں کو انعامات بھی دیا کرتا تھا۔ شیخ آذری اسفرائنی جو اپنے دور کا بہترین شاعر تھا، اسی بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ احمد نے اس کو ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا۔ آذری نے 'بہمن نامہ' کی تصنیف احمد شاہ کے حکم سے کی۔

علاؤالدّین احمد شاہ دوّم بن احمد شاہ اوّل (حکومت: ۸۳۸۔۸۶۲ھ/ ۱۴۳۶۔۱۴۵۸ء): علاؤالدّین فصاحت اور بلاغت میں کمال کا درجہ رکھتا تھا۔ فارسی زبان سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے علاوہ اس نے دوسرے علوم پر بھی کمال حاصل کیا تھا۔ جمعہ اور عیدین کے موقع پر خود مسجد جامع میں خطبہ پڑھا کرتا تھا۔ سلطان کی عدالت اور سخاوت کا شہرہ سارے ملک میں تھا۔

شمس الدّین محمد شاہ سوّم بن ہمایوں شاہ (حکومت: ۸۶۷۔۸۸۷ھ/ ۱۴۶۳۔۱۴۸۲ء): بادشاہ فیروز شاہ کے بعد بہمنی خاندان میں اس کے حسن و قابلیت کا کوئی ثانی نہیں ہوا۔ یہ بادشاہ اپنے وقت کا عالم تھا۔ نہایت ذکی و ذہین تھا۔ خوش نویسی و خطاطی میں مشہور تھا۔ تحریر و تقریر میں ادیب و بلیغ و فصیح تھا۔

بہمنی دور کے ادبا، شعرا و مشائخ:

بہمنی دور میں دکن کی سرزمین میں جو نامور علما، فضلا، شعرا اور مؤرخین گزرے، وہ انہیں مذکورہ سلاطین کی ادب پروری کا نتیجہ تھا۔ ذیل میں اس دور کے چند ادبا، شعرا اور مشائخ کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے۔

شیخ سراج جنیدی: شیخ سراج جنیدی ۶۷۰ھ/ ۱۲۷۱ء میں بمقام پیشاور پیدا ہوئے تھے اور محمد بن تغلق کے ہمراہ دکن آئے۔ ۱۲ شعبان ۷۳۰ھ/ ۳۱ مئی ۱۳۳۰ء سے انہوں نے بیجاپور میں اقامت اختیار کر لی اور پھر وہاں سے کُرچی چلے گئے۔ وہ علاؤالدّین حسن کے پیر تھے اور 'تذکرۃ الملوک' میں دونوں کے تعلقات کے متعلق کئی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ۷۸۱ھ/ ۱۴۷۸ء میں ۱۱۱ سال کی طویل عمر پا کر گلبرگہ میں وفات ہوئی۔ شیخ کا مزار جواب روضۂ شیخ کہلاتا ہے، اس وقت بھی گلبرگہ کی ایک ممتاز یادگار ہے۔

شیخ برہان الدّین: شیخ برہان الدّین غریب حضرت شیخ نظام الدّین اولیا کے ممتاز خلفا میں سے تھے۔ اہل دکن آپ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ شیخ رکن الدّین بن عماد کاشانی نے آپ کے ملفوظات ۷۳۲ھ/ ۱۳۳۱ء سے تا زمان رحلت جمع کیے اور اس کا نام 'نفائس الانفاس' رکھا۔ ۱۱ صفر ۷۳۸ھ/ ۸ ستمبر ۱۳۳۷ء (۱۶) میں آپ کی وفات ہوئی۔ خاندیش کے حکمران ناصر خان فاروقی (حکومت: ۸۰۱۔۸۴۱ھ/ ۱۳۹۹۔۱۴۳۷ء) نے شیخ کے نام پر 'برہان پور' نام کا شہر آباد کیا۔

شیخ زین الدّین: شیخ زین الدّین ایران کے شہر شیراز میں ۷۰۱ھ/ ۱۳۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد خواجہ حسین بن سیّد محمود شیرازی کی آغوش میں تربیت پائی۔ حرمین شریفین کی زیارت کے لیے اپنے وطن سے باہر آئے۔ مقامات متبرکہ کی زیارت اور حج سے مشرف ہو کر ہندوستان کا رخ کیا اور دہلی آ گئے۔ اور ۷۲۷ھ/ ۱۳۲۷ء میں جب دارالسلطنت دہلی سے منتقل ہوا تو دولت آباد آ گئے۔ وہ دکن کے بزرگ ترین اور صاف گو اولیا میں سے تھے۔ علاؤالدّین حسن گانگو بہمنی آپ سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ ناصر خان فاروقی نے خاندیش میں 'زین آباد' نام کا شہر شیخ زین الدّین کے نام سے آباد کیا تھا۔ ۲۵ ربیع الاوّل ۷۷۱ھ/ ۱۲ اکتوبر ۱۴۶۹ء کو شیخ کا انتقال ہوا اور خلد آباد میں مدفون ہیں۔ آپ کے ایک مرید شیخ امیر حسین نے آپ کے ملفوظات جمع کیے اور اس کا نام 'ہدایت القلوب' رکھا۔

گیسو دراز: سیّد محمد گیسو دراز حضرت شیخ محمد چراغ دہلی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شیخ چراغ دہلی کی وفات کے بعد سیّد محمد گیسو دراز دہلی سے ۸۱۵ھ/ ۱۴۱۲ء دکن تشریف لائے۔ اس وقت فیروز شاہ بہمنی دکن کا فرمانروا تھا۔ فیروز شاہ نے نہایت عزت و احترام سے ان کا استقبال کیا۔ لیکن چونکہ فیروز شاہ بہمنی حکیم طبیعت کا انسان تھا اور حضرت بندہ نواز نے علوم ظاہری اور خصوصاً معقولات کا ظاہری اکتساب نہیں کیا تھا، لہٰذا بادشاہ نے ان سے کسی خاص عقیدت کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس احمد خان جو بعد میں احمد شاہ ولی بہمنی کے نام سے تخت پر بیٹھا، حضرت گیسو دراز کا بہت زیادہ معتقد ہو گیا تھا۔ اس نے حضرت کے لیے خانقاہ تعمیر کرائی۔ ان کے صوفیانہ کلام سے مستفید ہوتا اور سماع کی محفلوں میں شریک ہوتا۔ حضرت گیسو دراز کے ملفوظات آپ کے مرید سیّد محمد اکبر حسینی نے 'جوامع الکلم' میں جمع کیے ہیں۔ آپ کی وفات گلبرگہ میں ہوئی اور اب وہیں مدفون ہیں۔

ملّا داؤد بیدری: ملّا داؤد بیدری سلاطین بہمنیہ کا وقائع نگار تھا۔ اس نے نثر میں بہمنی سلاطین کی تاریخ 'تحفۃ السلاطین' کے نام سے تألیف کی۔ یہ دکن کی اوّلین تاریخی کتب میں شمار ہوتی ہے اور فیروز شاہ بہمنی کے دور سلطنت میں لکھی گئی تھی۔ اگرچہ یہ کتاب اب ناپید ہے لیکن تاریخ فرشتہ کے مصنف محمد قاسم فرشتہ اور برہان مأثر کے مؤلف طباطبائی نے اسی کے ماخذات سے اپنی تاریخیں سجائی ہیں۔

ملّا محمد لاری: ملّا محمد لاری اپنے دور کا مشہور محقق اور مؤرخ تھا۔ اس کا اور ملّا داؤد بیدری کا زمانہ قریب قریب ایک ہی تھا۔

اس نے 'سراج التواریخ' کے نام سے بہمنی سلطنت پر یہ تاریخ مرتب کی تھی۔ یہ کتاب بھی اب دستیاب نہیں ہے۔لیکن فرشتہ اور طباطبائی نے اس سے کافی مواد اخذ کیا ہے۔

ملاّ عبدالکریم ہمدانی: ملاّ عبدالکریم محمد شاہ دوم کے دور سلطنت کا ایک مشہور عالم و فاضل اور مؤرخ تھا۔اس نے 'تاریخ محمد شاہی' کے نام سے ایک تاریخ مرتب کی تھی۔

ملاّ محمود بن ابراہیم بیدری: ملاّ محمود سلطان محمود شاہ بہمنی کے دور سلطنت کے ایک ادیب و فاضل بزرگ تھے۔انہوں نے 'معدن الذھب' کے نام سے ایک کتاب اسی دور میں تصنیف کی تھی جس میں علما، فضلا، شعرا و ادبا کے لطائف پیش کیے تھے۔

خواجہ محمود گاواں: خواجہ عمادالدّین محمود گاواں کی پیدائش گیلان شہر کے ایک قریہ گاواں میں ہوئی۔ان کی تربیت بہت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔محمود گاواں بڑے ذی علم وصاحب قلم تھے۔علوم معقول ومنقول میں اچھی دستگاہ اور اعلیٰ درجہ کا ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔آپ بحیثیت وزیر، سپہ سالار، مشیر شاہی، اہل علم وادب اور شہید مشہور ہیں۔۸۵۶ھ/۱۴۵۲ء میں علاؤالدّین بہمنی کے دور میں تجارت کی غرض سے اور دکن کے بزرگوں سے ملنے اور ان کی ملاقات سے فیضیاب ہونے کے ارادے سے احمد آباد بیدر پہنچے۔سلطان نے محمود کی عزت افزائی کی اور 'خواجہ جہاں' کا خطاب دیا۔محمد شاہ بہمنی سوم کے وزیر بھی رہے۔خود خواجہ محمود کے دربار میں کئی علما اور ندما موجود رہتے تھے۔اکابر علما و شعرا سے اس کے رفیقانہ مراسم تھے۔چنانچہ مولانا عبدالرحمٰن جامی، خواجہ عبیداللہ الاحرار صفی نقشبندی، شرف الدّین علی یزدی جو اپنے دور کے نامور علما و شعرا میں سے تھے اور ان کا شہرہ عالم اسلام میں تھا، گاواں سے حسن ظن رکھتے تھے۔مولانا جامی نے اپنی تصنیف 'شرح فصوص الحکم' کا ایک نسخہ گاواں کو پیش کیا تھا۔مولانا جلال الدین دوانی نے اپنی تصنیف 'شواکل الحور' جو شہاب الدّین سہروردی کی 'ہیاکل النور' کی تفسیر تھی، اس کا انتساب گاواں کے نام کیا تھا۔ملاّ عبدالکریم ہمدانی نے خواجہ کی سوانح عمری تصنیف کی تھی۔گاواں کی دو کتابیں بڑی مشہور ہیں۔ایک 'ریاض الانشا' اور دوسری 'مناظر الانشا'۔'مناظر الانشا' فارسی انشا پردازی پر ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔معاصرین علما و ادبا نے اس کی بڑی قدر افزائی اور توقیر کی تھی۔

'ریاض الانشا' محمود گاواں کی بیش قیمت تألیف ہے جو تاریخی مواد کے لحاظ سے ایک اہم دستاویز کی اہمیت رکھتی ہے۔خواجہ نے یہ کتاب محمد شاہ سوم کی ایما پر مرتب کی تھی اور سلاطین بہمنیہ اور خود اپنے مکاتیب و مراسلات بہ ترتیب پیش کئے تھے۔ان مکاتیب کی اہمیت گونا گون وجوہات کی بنا پر مسلّم ہے۔اوّلا یہ کہ خواجہ جہان کو عبارت آرائی خصوصاً انشا پردازی و مکاتیب نویسی میں کمال حاصل تھا اور اس کی انشا پردازی معاصرین علما و فضلا میں بڑی شہرت کی حامل تھی۔دوّم یہ کہ اب مکاتیب میں آدھے سے زیادہ ایسے مکاتیب ہیں جن سے اس دور کی معاشرتی زندگی، سیاست، جنگی معرکہ

آرائیاں، علما و مشائخین اور ان کے نظر و فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ ان مکاتیب سے خود محمود گاواں کی نجی زندگی اس کی افتادِ طبع اور طرز و فکر پر بھی مستند معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ تذکروں میں خواجہ جہاں محمود گاواں کے اشعار ملتے ہیں۔ خواجہ جہاں نے محمد شاہ بہمنی کی مدح میں قصیدہ کہا۔ فرشتہ نے اس قصیدہ کے یہ اشعار نقل کیے ہیں:

شد شکل ضرب تیغت بر دوش جان حمایل ہیکلش حرز سیفی وانگہ ہراس ای دل
تیغ تو آب حیوان مردم ز حسرت آن آری بعہد من شد آب حیات قاتل (۱۷)

اس کے علاوہ درج ذیل اشعار بھی ملتے ہیں:

چون شہید عشق در دنیا و عقبی سرخروست خوش دمی باشد کہ مارا کشتہ زین میدان برند

قطعہ:

بہ خدایی کہ جوہر امرش اہل معنی بہ خون دل سفتند
کہ چو بہتان یوسف و گرگ است آنچہ از بند دشمنان گفتند

خواجہ جہان کا قتل ۵ صفر ۸۸۶ھ/ ۱۵ اپریل ۱۴۸۱ء میں ایک سازش کے تحت ہوا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ 'طبقات محمود شاہی' خواجہ عبدالکریم النمد یہی جو کہ خواجہ جہان کے شاگرد اور مرید تھے، نے خواجہ کے قتل کی یہ تاریخ کہی:

شہید بی گنہ مخدوم مطلق کہ عالم را ز جودش بود رونق
و گر خواہی تو تاریخ وفاتش فرو خوان 'قصۂ قتل بنا حق' (۱۸)

عصامی: عصامی معروف بہ 'فردوسی ہند'، ہندوستانی شاہنامہ 'فتوح السلاطین' کا مصنف ہے۔ ان کی پیدائش ۷۱۱ھ/ ۱۳۱۱ء میں ہوئی۔ ۷۲۱ھ/ ۱۳۲۷ء میں دہلی سے دولت آباد ہجرت کی۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ کیونکہ کوئی وارث نہیں تھا، اس لیے انہوں نے ادبی دنیا میں کوئی ایسا کارنامہ چھوڑنا چاہا جو ان کے نام کو زندہ رکھ سکے۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے مثنوی 'فتوح السلاطین' لکھی جس کی تکمیل مدّت ۵ ماہ ۹ دن ہے۔ یہ ہندوستان کی مسلم سیاسی تاریخ ہے جس کا آغاز محمود غزنوی کی آمد سے تغلق عہد کے مفصل واقعات اور علاؤالدّین بہمن شاہ کے دور کے واقعات پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دکن کی پوری منظوم تاریخ بھی ہے۔ عصامی نے بہمنی سلطنت کے بانی اور اس خاندان کا مفصل حال بیان کیا ہے اور اپنے سرپرست سلطان علاؤالدّین کی مبالغہ آمیز تعریف کی ہے۔ تاریخی حیثیت سے یہ کتاب مستند اور اہم ہے۔

شیخ آذری: نام نورالدین حمزہ، طوسی اور بیہقی اسفرائنی کے لقب سے مشہور تھے۔ جائے پیدائش اسفرائن ہے اور اسی شہر میں پرورش و تربیت ہوئی۔ آذری کو بچپن سے ہی شعر و سخن کا ذوق تھا اور بہت جلدی شہرت حاصل کر لی۔ بڑھتے بڑھتے اس کی شاعری کا شہرہ مرزا شاہ رخ بن تیمور (حکومت: ۸۰۷۔۸۵۰ھ/ ۱۴۰۵۔۱۴۴۶ء کے دربار تک پہنچ گیا۔ شہنشاہ نے آذری

کواپنے دربار سے منسلک کراس کوملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا۔

آذری صوفی منش آدمی تھا اسے دربار وسرکار سے بڑی وحشت ہوتی تھی اواس کا زیادہ وقت فقرا، مشائخین کی صحبت میں گزرتا تھا۔عمر کے ساتھ ساتھ تصوف اور راہ سلوک کی طرف اس کا رجحان قوی ہوگیا۔اسی دوران اس نے حضرت شیخ محی الدین طوسی (وفات: ۸۳۰ھ/ ۱۴۲۷ھ) کے دست مبارک پر بیعت کی اور اپنے مرشد کی محبت میں حج بیت اللہ سے بھی شرف یاب ہوا۔ حج سے واپسی پر حضرت شیخ کا انتقال ہوگیا تو آذری حضرت شاہ نعمت اللہ ولی (وفات: ۸۳۲ھ/ ۱۴۲۹ء) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا اور آپ ہی کی ایما پر شہاب الدّین احمداوّل کے دورحکومت میں بیدر چلا گیا۔سلطان نے آذری کی بہت قدر ومنزلت کی۔اسے ملک الشعراء کا خطاب دیا۔سلطان ہی کی گذارش پر آذری نے بیدر میں 'بہمن نامہ دکنی' کا کچھ حصہ قلمبند کیا اور کچھ حصہ خراسان واپسی میں تحریر کیا۔شیخ آذری نے رخصت کے وقت بادشاہ کے حضور میں عہد کیا تھا کہ تادام الحیات 'بہمن نامہ دکنی' کے لکھنے میں مصروف رہے گا اس واسطے جب تک خراسان میں زندہ رہا اکثر اوقات بہمن نامہ کی تألیف میں صرف کرتا رہا اور سال بھر کے عرصہ میں جو کچھ بھی نظم ہوتا تھا، اسے دارالخلافہ دکن بھیجتا تھا۔۸۶۶ھ/۱۴۶۲ء(۱۹) میں ۸۲سال کی عمر میں آذری کا انتقال ہوا۔مادۂ تاریخ 'خسرو' ہے اور شعر یہ ہے:

دریغا آذری شیخ زمانہ — کہ مصباح حیاتش گشتہ بی ضو
چراغ دل بمفتاح حیاتش — بانواع حقائق داشت پرتو
چو او مانند خسرو بود در شعر — ازاں تاریخ فوتش گشت خسرو (۲۰)

آذری فارسی اور دکنی کا شاعر تھا۔'بہمن نامہ دکنی' دکن کی منظوم تاریخ ہے۔آذری نے داؤد بیدری کی 'تحفۃ السلاطین' سے مواد اخذ کر کے شاہنامہ فردوسی کی طرز پر بہمن نامہ تصنیف کیا تھا۔'بہمن نامہ' آذری کی موت کے باعث نامکمل رہ گیا۔بعد میں ملاّ سامعی اور ملاّ نظیری نے اس کا تکملہ کیا۔تکملہ کا نام 'ملحقات بہمن نامہ' رکھا۔آذری نے بہمن نامہ فارسی اور اس کا کچھ حصہ دکنی میں نظم کیا۔اب یہ ناپید ہے۔البتہ فرشتہ نے اسے دیکھا تھا اور اس سے استفادہ کیا تھا۔آذری کی دیگر تصانیف میں مرآت (عجائب الغرائب، عجائب الاعلا، عجائب الدنیا)، جواہر الاسرار، دیوان آذری قابل ذکر ہیں۔چند اشعار درج ذیل ہیں:

بہ مجلسی کہ درو گنج کبریا بخشند — ہزار افسر شاہی بیک گدا بخشند
دلا بہ میکدہ ہا روز و شب گدای کن — بود کہ دُرد کشان جرعہ ای بما بخشند
شدیم پیر بہ عصیان و چشم آن داریم — کہ جرم ما بہ جوانان پارسا بخشند

متفرق اشعار:

خوش حیات ست کسی را کہ پس از جان دادن دوستان بر سر خاکش بزیارت آیند
قیمت دولت وصل تو اگر جان بودی کار برعاشقان دل سوختہ آسان بودی

ملاّ نظیری: محمد تقی نام، ملاّ نظیری تخلص یا ادبی لقب تھا۔ طوس کے رہنے والے تھے اور شاہ نعمت اللہ کے حلقہ بگوش تھے۔ خواجہ جہاں محمود گاواں کی دعوت پر دکن آئے۔ خواجہ جہاں نے ان کو ملک الشعراء کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ یہ سلطان علاؤالدّین احمد دوّم کا دور سلطنت تھا۔ جب ہمایوں شاہ بہمنی (حکومت: ۸۲۶۔۸۶۵ھ/ ۱۴۵۸۔۱۴۶۱ء) کا دور آیا تو شاہ نعمت اللہ کے خانوادے سے قریبی تعلقات کی وجہ سے سلطان ملاّ نظیری سے بدظن ہو گیا یہاں تک کہ ان کو قید کر دیا گیا۔ ایک مقتدر یوسف ترک کی سفارش پر ان کو رہائی ملی۔ لیکن وہ سلطان کی زیادتی کو فراموش نہ کر سکے۔ سلطان ہمایوں شاہ کی وفات پر انہوں نے جو قطعہ لکھا وہ اس بات کا ثبوت ہے۔

ہمایوں شاہ مُرد و رست عالم تعالی اللہ زہی مرگ ہمایوں
جہان پر ذوق شد تاریخ فوتش ہم از ذوق جہان آرید بیرون (۲۱)

ملاّ نظیری نے شیخ آذری کے 'بہمن نامہ' کا تکملہ لکھا تھا، اس کو 'ملحقات بہمن نامہ' نام دیا۔

ملاّ سامعی: سامعی ملاّ نظیری کا ہمعصر، دکنی و فارسی کا مشہور شاعر تھا۔ ملحقات بہمنی نامہ یعنی بہمن نامہ دکنی کے تکملہ میں یہ بھی نظیری کے ساتھ شریک رہا۔ سامعی محمود گاواں کا بے حد معتقد تھا اور ان دونوں میں رفاقت و یگانگی تھی۔ اس نے خواجہ کے قتل کی درج ذیل تاریخ کہی تھی:

چون خواجۂ جہان را ہر گز حرامخواری در دل نبود و می کرد پیوستہ جانسپاری
گشت او شہید مغفور ای سامعی بہ تحقیق تاریخ کشتن او جوی از حلال خواری (۲۲)

احمد آباد بیدر کے میں خواجہ محمود گاواں کے ذریعہ بنائے گئے مدرسہ کی تاریخ بنا بھی کہی:

این مدرسہ رفیع محمود بنا چون کعبہ شداست قبلۂ اہل صفا
آثار قبول بین کہ شد تاریخش از آیت 'ربّنا تقبّل منّا' (۲۳)

مختصر یہ کہ بہمنی سلاطین نے فارسی زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور شعرا و ادبا کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ نتیجتاً اہم تالیفات سامنے آئیں جن سے فارسی زبان و ادب کے گنجینے میں بیش بہا اضافہ ہوا۔

حواشی:

۱۔ محبوب الوطن، ص ۹۲، ۲۔ تاریخ فرشتہ، ج ۱، ص ۲۷۷، سلسلہ آصفیہ، ص ۹۰۔۹۱، ۳۔ تاریخ فرشتہ، ج ۱،

ص۲۸۱، ۴۔محبوب الوطن،ص۲۸۰، ۵۔محبوب الوطن،ص ۳۸۸، ۶۔تاریخ فرشتہ، ج۱، ص۲۹۶، ۷۔تاریخ فرشتہ اور حدایق السّلاطین میں اس بادشاہ کا نام محمود بن علاؤالدّین حسن بہمنی لکھا ہے اور تاریخ وفات ۷۹۹ھ/ ۱۳۹۷ء بتائی ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ علاؤالدّین حسن بہمنی کا محمود خان نامی ایک فرزند ضرور تھا لیکن وہ بادشاہ نہیں ہوا اور نہ اس کے متعلق کسی تاریخ سے یہ علم ہوا کہ وہ شاعر تھا۔ البتہ اسی کا بیٹا محمد خان اپنے چچا داؤد شاہ کے مرنے پر سلطان محمد کے نام سے تخت نشین ہوا اور اس کے شاعر ہونے کے متعلق تاریخوں میں مرقوم ہے۔ کلام الملوک،ص۔۴، ۸۔تاریخ فرشتہ، ج۱،ص۳۰۲، ۹۔میر فضل اللہ انجو شیرازی محمد شاہ بہمنی بن علاؤالدّین حسن گانگو بہمنی کے دورۂ حکومت میں صدر کے عہدے پر فائز تھے۔ علما، فضلا اور شعرا کی سرپرستی کرتے تھے۔ شعرا میر فضل اللہ کے وسیلے سے بادشاہ تک اپنے قصائد پہنچاتے اور انعام واکرام حاصل کرتے تھے۔ تاریخ فرشتہ، ج۱، ص۳۰۲، ۱۰۔تاریخ فرشتہ، ج۱،ص۳۰۲، حدایق السلاطین،ص۷۶۔۷۸، ۱۱۔ایضاً اور کلام الملوک، ص۶، ۱۲۔تاریخ فرشتہ، ج۱،ص۳۰۹، ۱۳۔ایضاً، ج۱،ص۳۰۸، ۱۴۔ایضاً، ۱۵۔ایضاً، ج۱،ص۳۲۲، ۱۶۔محبوب ذی المنن، ج۱،ص۱۶۲، ۱۷۔تاریخ فرشتہ، ج۱،ص۳۵۷ ۱۸۔تاریخ فرشتہ، ج۱،ص۳۵۷، ۱۹۔تذکرۃ الشعراء،ص۴۰۴، ۲۰۔تذکرۃ الشعرا،ص۴۰۵ ۲۱۔طبقات اکبری، ج۳،ص۱۴۱ اور برہان مآثر،ص۹۵، ۲۲۔تاریخ فرشتہ، ج۱،ص۳۵۸، ۲۳۔ایضاً

منابع و مآخذ

۱۔ برہان مآثر، سیّد علی طباطبا، مطبع جامعہ دہلی، ۱۹۳۶ء

۲۔تاریخ فرشتہ، محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ، نولکشور، کانپور، ۱۲۹۰ھ

۳۔تذکرۃ الشعرا، دولت شاہ سمرقندی، تصحیح ایڈورڈ براؤن، کیمبرج، انگلینڈ، ۱۹۰۰ء

۴۔ دکن کے بہمنی سلاطین، ہارون خان شروانی، مترجم رحم علی الہاشمی، قومی کونسل برای فروغ اردو زبان، نئی دہلی، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۹۸ء

۵۔حدایق السلاطین فی کلام الخواقین، علی بن طیفور البسطامی، تصحیح دکتر شریف النسا انصاری، دانشگاہ عثمانیہ، حیدرآباد

۶۔سلسلہ آصفیہ، جلد سوّم، تاریخ دکن، حصّہ اوّل، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۷ء

۷۔طبقات اکبری، نظام الدّین احمد، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۹۳۶ء ج۳

۸۔فارسی ادب بعہد سلاطین تغلق، شیعب اعظمی، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۵ء

۹۔کلام الملوک (سلاطین دکن کا فارسی کلام)، مرتبہ میر سعادت علی رضوی، سلسلہ یوسفیہ، شمارہ ۳، ۱۳۵۷ھ
۱۰۔محبوب ذی المنن، تذکرہ اولیائے دکن، عبدالجبار خان، ج ۱و۲، مطبع رحمانی، حیدرآباد، دکن
۱۱۔محبوب الزمن، تذکرہ شعرائے دکن، عبدالجبار خان، حصّہ ۱، مطبع رحمانی، حیدرآباد، دکن، ۱۳۲۹ھ
۱۲۔محبوب الوطن، تذکرہ سلاطین دکن، عبدالجبار خان، مطبع رحمانی، حیدرآباد، دکن، ۱۳۲۸ھ
۱۳۔Gandhi Dictionary of Indo-Persian Literature, Nabi Hadi, Indira National Centre for the Arts, Abhinav Publications, 1995

☆☆☆

آئینہ تحقیق

محمد کاشف رضا

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی

پایان نامہائے شعبہ فارسی، دانشگاہ ہندوی بنارس

بنارس ہندو یونیورسٹی ہندوستان کی قدیم درسگاہوں میں سے ایک ہے اور اپنے عہد بناء سے عہد حاضر تک اس کا شمار اچھی درسگاہوں میں رہا ہے۔ اس کے بانی 'بھارت رتن' پنڈت مدن موہن مالویہ نے عہد بناء میں دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب کا شعبہ بھی قائم کرایا تھا تب سے آج تک یہ شعبہ اپنے مخصوص گونا گوں کارہائے نمایاں کے لئے جانا جاتا رہا ہے۔ شعبہ فارسی، بنارس ہندو یونیورسٹی نے فارسی ادب کو کچھ ایسے اساتید بھی دئے ہیں جو اپنے ادبی کاموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے زمانہ گذشتہ کے اساتذہ میں سے پروفیسر امرت لعل عشرت، ڈاکٹر سید عادل حسین جعفری اور پروفیسر شمیم اختر فارسی ادب کی دنیا میں کسی تعریف وتعرف کے محتاج نہیں عہد حاضر میں پروفیسر سید حسن عباس رضوی اور ڈاکٹر محمد عقیل اپنی بیش بہا خدمات سے فارسی ادب کو فروغ دے رہے ہیں۔ بہت دنوں سے یہ خواہش تھی کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے پایان ناموں کی فہرست شائع کی جائے خدا کا شکر ہے کہ وہاں کے ریسرچ اسکالر محمد کاشف رضا نے لایبریری میں موجود نایان ناموں کی یہ فہرست اشاعت کے لئے ارسال جو شامل اشاعت ہے:

نمبر شمار	کیٹلاگ نمبر	عنوان مقالہ	مقالہ نویس	نگراں	سن
۱	O16402(Y15)168M8H	ہندوستانی فارسی ادب میں خواتین کا حصہ	سیدہ خورشید فاطمہ حسینی	ڈاکٹر سید عادل حسین جعفری	۱۹۸۸
۲	O164,1g,n1a1	مشاہیر شعرائے اردو کی فارسی خدمات از مظہر تا مظہری	انیس احمد	ڈاکٹر سید عادل حسین جعفری	۱۹۹۱
۳	O164,1nna,g	احوال وآثار استاد سعید نفیسی	محمد سلطان عباس رضوی	مولانا سید محمد سلیمان عباس رضوی	۱۹۸۴

۴	O164,3no3,g	صادق ہدایت-احوال وآثار	عادل حسین جعفری	مولانا سید محمد سلیمان عباس رضوی	۱۹۸۴
۵	O164,v2l,168m7a	فارسی ادب بہ عہد بہادر شاہ ظفر	ابوالحسن اختر	مولانا سید محمد سلیمان عباس رضوی	۱۹۸۷
۶	O164,152,m8j	شیخ سعدی کا نیتک درشن -ایک وویچنا تمک انوشیلن	تنویر فاطمہ جعفری	ڈاکٹر سید عادل حسین جعفری	
۷	O164,(w81),g	Revolutionary Literature in Persian in 20th century	عبد الحسین نیک زاد	پروفیسر شمیم اختر	۱۹۸۸ء
۸	O164,k2j6,11l9k	Persian Literature during the period of Jahangir	حفیظ الدین کرمانی		۱۹۷۹ء
۹		Ēminent Persian Poets of Punjab during the Mughal Period	محمد اکرم الحق	پروفیسر شمیم اختر	۱۹۹۳ء
۱۰	O164,1g,m2s	Four Glorious poetessess of Modern Persian Poetry	شہناز زہرہ		۱۹۸۲ء
۱۱	O164,1k92,gm6a	Shaikh Ali Hazin: Life & Works, with special refrences of his poetry	شمیم اختر	پروفیسر امرت لعل عشرت	۱۹۸۶ء
۱۲	O164,6n32g,n3v	Prof. Noor-ul-Hasan Ansari: Life & Persian works	وکیل احمد	ڈاکٹر سید عادل حسین جعفری	۱۹۹۳ء

چشم بینش

محمد ارشاد احمد (ڈاکٹر)
آمنہ منزل، اسلامیہ نگر، سیوان، بہار

غالب کے کلام میں سائنسی کہکشاں (مرتبہ محمد آزاد حسین): ایک تعارف

مرزا غالب (1797-1869) کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے، انہوں نے شعری اور نثری دونوں اصناف میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ اس بات سے سبھی ناقدین متفق ہیں کہ غالب کی زبان مشکل اور ادق تھی۔ مرزا غالب کو بھی اس بات کا احساس تھا اس لئے انہوں نے کہا:

☆ گر خاموشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں میری بات سمجھنی محال ہے
☆ یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مرزا غالبؔ کی شاعری میں اس مشکل پسندی، معنوی تہہ داری اور فلسفیانہ مضامین کی تفہیم کی پہلی عملی کوشش مولانا الطاف حسین حالیؔ (1837.1914) نے ''یادگار غالب'' کی تخلیق کے ساتھ شروع کی۔ یہ کتاب مرزا کی شاعری، شخصیت اور عادات واطوار کو سمجھنے میں کافی معاون ثابت ہوئی چونکہ مولانا نے مرزا کو قریب سے دیکھا تھا اور برسوں ان کی صحبت میں گزارے تھے، اس لئے انہوں نے مرزا کے بارے میں جو لکھا وہ حقیقت اور صداقت پر مبنی تھا۔ مولانا کے بعد نظم طباطبائی نے دیوان غالب کی شرح لکھی، جو کافی مقبول ہوئی۔ اس کے بعد دیگر کئی اصحاب نے اس طرف توجہ فرمائی چنانچہ اب تک درجنوں شرحیں اور ہزاروں تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں اتنا کچھ ہونے کے باوجود غالب کی شاعری کی تفہیم و تشریح کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ غالبؔ کے شعری اظہار کی کثرت آرائی ہمیں استعجاب میں مبتلا کرتی ہے اس کے اثرات سے قاری کا محفوظ رہنا مشکل ہے وہ کسی نہ کسی موضوع یا مبحث سے متحرک ہوتا ہے یہی تحریک اس کے نہاں خانۂ دل میں جنبش پیدا کرتی ہے اور وہ قاری غالبؔ کے طرفداروں میں شامل ہو جاتا ہے۔ غالبؔ کے فن کا اعجاز ہی ہے کہ ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں غیر معمولی طور پر جدت، تخیل اور فکر سے ممتاز ہے اور فکر کی پرواز اور تخیل کی رفعت اور بلندی نے ان کی شاعری کو غیر معمولی عظمت بخشی ہے۔

مرزا غالبؔ کی شاعری سے محمد مستقیم (پ۱۰،اکتوبر ۱۹۳۱) کی ذہنی اور فکری وابستگی اور اس کے اثرات سے معرض وجود میں آنے والے مضامین مرزا کی شاعری کی طرح ہی ہمیں استعجاب میں مبتلا کرتے ہیں دیگر شارح حضرات سے الگ ہٹ کر محمد مستقیم صاحب نے مرزا غالبؔ کو خالص سائنس کا فنکار ثابت کر دیا ہے۔ایک انٹرویو میں آپ نے بتایا تھا کہ وہ بچپن سے ہی غالب کے اشعار سے کافی متاثر تھے آپ کے گاؤں کے شمس الدین صاحب، جو لاہور میں ملازمت کرتے تھے اور احسان دانش کے ساتھ رہتے تھے، انہیں فن شاعری سے واقف کرایا اور لاہور سے کئی ادبی کتابیں لا کر انہیں مطالعہ کے لئے دیں۔شمس الدین صاحب نے ہی محمد مستقیم صاحب کو مرزا غالبؔ کی شاعری کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ مرزا کا ذہن سائنس کے کارناموں سے متاثر تھا انہوں نے اسے ثابت کرنے کے لئے مرزا کے کئی اشعار پیش کئے۔ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ کبھی بھی شارحین اور ناقدین کا ذہن اس طرف مبذول نہیں ہوا ہے کچھ دنوں بعد بہار کے مایہ ناز شاعر اجتبیٰ رضوی سے آپ کی ملاقات ہوئی۔اجتبیٰ رضوی کی قربت سے شعر کی تفہیم آسان ہوئی اور تخلیقی رجحان پروان چڑھا۔ انہوں نے مرزا غالبؔ کے اشعار کا سائنس علی الخصوص علم الطبیعیات کے مختلف اصولوں سے موازنہ کیا تو اس میں صداقت نظر آئی۔انہوں نے دیوان غالبؔ پر حاشیہ لکھنا شروع کیا۔اس طرح انہوں نے مرزا غالبؔ کے اشعار کی نئی تفہیم و آگہی پر مبنی ایک طویل مضمون لکھا اور آجکل (اردو) نئی دہلی کو ارسال کر دیا وہ مضمون شائع ہوا اور ملک کے مختلف مقامات سے کئی اصحاب کے ستائش نامے موصول ہوئے۔اس سے خیال اور ذہن میں پختگی آئی کچھ دنوں بعد شعور کچھ اور بالیدہ ہوا اور مطالعہ میں وسعت آئی تو آپ نے اس موضوع پر کئی مضامین لکھ ڈالے جو آجکل کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقتدر رسالوں میں شائع ہوئے۔محمد آزاد حسین (علی گڑھ) نے ان تمام مضامین کو یکجا کر کے ان کے مختصر سوانحی کوائف اور جامع مقدمہ کے ساتھ پبلی کیشن ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۲۰۱۵ء میں شائع کرایا ہے۔

پیش نظر کتاب میں محمد مستقیم صاحب کے کل بارہ مضامین شامل ہیں ان تمام مضامین میں مرزا غالبؔ کے سائنس رسا ذہن اور ان کے اشعار میں سائنسی نکتہ رسی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔مستقیم صاحب نے اپنے مضامین میں یہ ثابت کیا ہے کہ مرزا کو سائنس کے اصولوں سے کما حقہ واقفیت تھی، مصنف کا دعویٰ ہے کہ ان کا ذہن اس قدر سائنسی تھا کہ جو ایجادات مرزا کی وفات کے بعد معرض وجود میں آئیں ان کی بھی پیشن گوئی انہوں نے کر دی تھی۔واضح ہو کہ اس کتاب سے قبل محمد مستقیم صاحب کی درج ذیل تین کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔۱: غالب ایک سائنس داں (۲۰۰۲ء)،۲: ترجمہ دیباچۂ غالب (۲۰۰۶ء) اور ۳: غالب کی نئی دنیا (۲۰۰۷ء)۔ذیل میں جناب محمد مستقیم صاحب کے ان مضامین کی فہرست پیش خدمت ہے جو مذکورہ تصنیف میں شامل ہیں:

۱: رقص نالہ

۲: آفاقی ٹاکیون یا غالب کا ذوق فرتاب

۳: غالب معلوماتی عہد کا مفکر

۴: غالب کی تین سائنسی نظمیں

۵: نیوٹن کی روایت میں غالب کے نقش قدم

۶: غالب اختر سیاہ کی زبانی

۷: غالب کا قصیدہ (غار سیاہ کی دادخواہی....)

۸: شیلی اور غالب میں پرومیتھیو کا کردار

۹: فلسفۂ وقت اور غالب

۱۰: غالب کی تفہیم فطرت چند جھلکیاں

۱۱: نظام ارضی کی شکست: نظام شمسی کی فتح

۱۲: غالب کا قصیدہ ۶۲

۱۳: غالب کا قصیدہ ۶۱

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ دیوان غالب کے مفسرین کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن کسی نے انہیں سائنسی علوم سے بہرہ ور اور سائنس رسا ذہن کا حامل شخص نہیں بتایا ہے بہر کیف محمد مستقیم صاحب نے جس زاویۂ نگاہ سے غالب کو دیکھا ہے وہ بالکل نیا، اچھوتا اور انوکھا ہے۔ آخر میں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ جن ناقدین و شارحین نے غالب کے اشعار کو مختلف زاویوں اور نظریوں سے دیکھا اور پرکھا وہ سب قابل احترام ہیں لیکن غالبؔ کو ایک سائنس داں کی حیثیت سے سامنے لانا اور اس میدان میں ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنا یہ کام محمد مستقیم صاحب نے ہی کیا، وہ یقیناً یہ کام لایق ستائش ہے اور باب غالب میں ایک گراں بہا اضافہ بھی۔ مجھے امید ہے کہ قارئین اس کتاب کو پسند فرمائیں گے خاص کر سائنس کے طلبہ جنہیں اردو ادب میں گہری دلچسپی ہے وہ ضرور پسند کریں گے۔ اشاعت پر اگر بات کی جائے تو کمپوزنگ میں کچھ غلطیاں ضرور در آئی ہیں مگر طباعت دیدہ زیب ہے کتاب کے حصول کا پتہ نیچے درج کیا جا رہا ہے:
ملنے کا پتہ: محمد آزاد حسین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ (+91 9457921760)

☆☆☆

S. No.: 9 ISSN- 2394-5567

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quaterly Literary Research Journal For Persian Literature)

VOLUME:- III **ISSUE:- IV**

OCTOBER TO DECEMBER 2016

Editor:
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:
Dabeer Hasan Memorial Library ,12, Choudhari, Mohalla, Kakori, Lucknow, U.P., India-226101
Email:- **dabeerpersian@rediffmail.com**
Mob. no:- 09410478973

Founder:- **Professsor Umar Kamaluddin Kakorvi,** LU, Lucknow.

Chief Supervisor:- **Professor S. M. Asghar Abidi**, AMU, Aligarh.

Supervisor:- **Dr. Anjuman Bano Siddiqui,** Lucknow.

Editorial Board

Professor Syed Hasan Abbas, BHU,

Professor S M A Khursheed, AMU,

Professor Aleem Asharaf Khan, DU,

Dr. Shahid Naukhez Azmi, MANUU,

Dr. Muhammad Aqeel, Persian, BHU,

Dr. Muhammad Qamar Alam, AMU,

Zunnoorain Haider Alavi, Editor Bi-Annual **TASFIYA**, Kakori, Lucknow.

Naqi Abbas Kaifi, Editor Quaterly **NAQD-O-TAHQEEQ**, Delhi.

Arman Ahmad, Editor Quaterly **IRFAN**, Chapra, Bihar.

Co-Editors

Mohammad tauseef, AMU, Aligarh

Atifa Jamal, Lucknow

Munazir Haque, AMU, Aligarh

Muhammad Hasan, AMU.

Muhammahd Anash, AMU, Aligarh

Sarim Abbas, AMU, Aligarh

Asharf Ali, AMU, Aligarh

Dr. Rajesh Sarkar, BHU, Varanasi

Mohammad Jafar, JNU, Delhi

Saduddeen, AMU, Aligarh

Review Comiitee

Professor Azarmi Dukht Safavi, Director IPR, AMU, ALigarh.

Professor Shareef Hussain Qasmi,, Ex-Dean, F/0 Arts, DU, Delhi,

Professor Mohammad Iqbal Shahid , Dean F/o Laguages Islamic & Ori. Lear. , GCU, L.

Prof. Abu Musa Muhammad Arif Billah, Al Biruni Faundation, Dhaka.

Professor Abdul Qadir Jafery, HOD Arbic & Persian, A. University.

Advisory Board

Professor Ziyauddin Ahmad Shakeb Kakorvi,

Professor Panna Lal, HOD History,AU

Professor Ram Sumer Yadav, Lucknow

Professor Musheer Hussain Siddiqui, LU

Dr. Gulfihsa Khan, AMU

Dr, Ata Khursheed, MA Liberary, AMU

Dr. Pradeep Jain, Allahabad.

Dr.(Ms.) Berna Karagözoglu, Agri Ibrahim Çeçen University, Turkey.

Dr. Iftikhar Ahmad, M A College, Colcata.

Dr. Alam Azmi, KMCUAFU, Lucknow.

Dr. Arshad Qadiri, Lucknow University,

Dr. Sakina Khan, HOD Persian, MU,

Dr. Shahram Sarmadi, Tehran, Iran.

Dr. Prashant Keshavmurthy, Macgill Univ.

Inci Celikel, Anatoliya Univerity, Turky.

Sarfaraz Ahmad Khan (Dr.)

Assistant Professor, Dept. of Persian, MANUU. Lucknow Campus

Journey of Iranian Films after the Islamic Revolution

In current scenario the Iranian movies have won a number of international and of course national awards generated a lot of interest from national and international film lovers and critics. It might be surprising to the audience and viewers of films that the 'Golden Age' of the Iranian cinema coincides with the Islamic Revolution. The films that have been produced since the mid 1980s till now, shows the most important phase in the growth of Iranian thought and culture. Love for the country, gender inequality, oppression, patriotism, women's right, excitement about theme and content, commitment, experiments with form and content, social issues- all this and more are embodied in post- revolution cinema.

An analysis of the recent development of Iranian cinema should primarily mention its origins and history, especially since Iranian cinema always has been so closely linked to the political circumstances dominating the social reality. Its outset is generally accepted to have begun around 1900, when Mirza Ebrahim Khan Akkas Bashi, the official photographer of Muzaffar al-Din Shah, shot the first Iranian documentary. Despite this relatively late start, Iranian cinema caught up to the West and developed a lively film industry. Though, this statement has to be seen in a context which takes in consideration the fundamental factors almost always present and dominant in Iranian cinema; the political framework which of course includes censorship. As Richard Tapper states in his work, The New Iranian Cinema:

"Both government and religious authorities sought to control the images to be shown publicly."(1)

Formal censorship' began in the 1920s, when the imported films exhibiting women, sex and amusement, dominated the Iranian market. In contrast to this permissive attitude, depicting the political or social reality critically in local productions was taboo. Until the Second World War nothing worthy of being called 'national cinema' was produced. In these decades, Iranian films were mainly remakes of foreign works, mainly Indian or Egyptian or Turkish and normally they lacked artistic quality. This genre of films is known as 'Film Farsi'. Susan Hayward in her book 'Cinema Studies; the Key concepts states that:

"Along with the development of film comes the history of censorship, which tries to curb the freedom of expression in increasingly institutionalized manners. Indeed, in 1950 a committee for the supervision of locally produced or imported films was established. This might have contributed to the fact that in the 1950s and 1960s, next to the import of American and Indian films, only 'commercial films' were famous in Iran, whose sole aim was to entertain and to fill the cash tills."(2)

Keeping in mind the statement of Susan Hayward we can say n this period too, the censorship worried more about the expression of political opinions than about the demonstration of sex. However, on the edge of mainstream productions slowly evolved few other interesting and formative films. Another interesting fact about the birth of Iranian Cinema mentioned in Oxford History of World Cinema:

"1969 is generally agreed to mark the birth of Iranian art cinema, called the new wave. In the following period various films were successfully presented to international film festivals. However, from its beginning on, the evolution of Iranian cinema was constantly accompanied by a consistent religious opposition. Through the lens of many Iranian clerics, films were immoral. They denounced cinema as a tool to access corrupt western influence into Iran. This suspicion and aversion against cinema, which was deep-rooted in many Iranian clergymen found later on as well expression in the Islamic

Republic."(3)

So the promoters of the Islamic Revolution, branded the Iranian cinema in the same breath as westernization and furthermore, the early Pahlavi regime also played vital role in curbing the artistic expressions of the directors. But all regimes were well aware of the popularity of cinema and its power to influence masses. Earlier, the Pahlavi regime and later on, Islamic leaders seemed to recognize cinema as a vehicle to fight the opposition or the adversary.

Before the Islamic Revolution it is generally believed that the history of Iranian cinema began with the Qajari king Muzaffaruddin Shah's photographer Mirza Ibrahim Khan Akkas who after returning from England introduced the Bio- scopic cinema in Iran. After sometime the first Iranian Movie called Abi and Rabi was made by a migrant English man Ovanis Ognanians. He produced next another famous film in 1932 named Haji Agha, Actor-i- Cinemai. The breakthrough came in Iranian movie industry when the first talkie film Dokhtar-i-Lar, was made in India by Ardshir Irani of Imperial films, Bombay. It was later screened in Iran some time during 1933-34. But the strict policy of the government and censor ship resulted a serious setback to the film producing companies in Iran and very few existed in early 1940s. His next film Firdausi which was released in 1934, was previewed by the then Pahlavi ruler Reza Shah Pahlavi himself.

The father of Iranian cinema Ismaiel Kushan returned from Germany after completion his studies in 1948 after the World WarII bringing in two foreign films dubbed in Persian. The popularity of these films and some other Persian sub-titled films led him to establish two studios called Pars and Mitra film studio. Ismail's first home production and Iranian's first Desi made film was Toofan-i Zindagi (Storm of Life). The themes were plight of women in general, gender inequality and socio-cultural issues like domination of male in society.

For long time the Iranian films copied the prototyped western films of

America and also Indian and Egyptian movies. In the Pahlavi regime specially in Reza Shah Pahlavi's era the Iranian films in 1950s and 1960s entered in a more fascinating and innovative phase. With the advent of new technology and high tech cameras attracted not only the Iranian audience but, film making began to be seen as a cultural, social and political phenomenon in which film makers expressed their feelings and ills of the society also. Shorts films and documentaries made by Ebrahim Gulistan and Mohsin Makhmalbaf gave way to new concept, maturity and style in Iranian cinema.

In the year 1969 the Iranian cinema entered in a new phase and that was called the Real Wave cinema or the Iranian Art film with the making of three films which were Gaw (The Cow) of Daryush Meharjui, Qyser by Masud Kimyayee and Aramash Jolu-e Digran (Calm in front of Others) by Nasir Taqwaie. This was an era when films began to be seen as playing a crucial role in pointing out the changes in the society, social and cultural changes, realistic characters and their problems.

Films after the Islamic Revolution of 1979

In his article The Iranian Cinema, Godfrey Cheshire observed that:

"Defying all predictions and contrary to general belief, the Islamic Revolution, instead of wiping the screens of films, has ushered in a period of good meaningful, artistically made films. Today Iranian cinema is acknowledged as one of the most innovative and interesting in the world winning prestigious awards at international and national festivals."(4)

It is very surprising and very interesting fact that for last ten years perhaps not a single year has passed without an international award being given to an Iranian film. The likes of Mohsin Makhmalbaf, Kia Rustami, Tahmineh Milani, Samira Makhmalbaf and Dariyush Meharjuii are familiar and popular to the film goers of the world. Committed writers like Ghulam Hussain Saeedi, Samad Behrangi, Farugh- e Farrukhzad and Daryush Mehrjui began to write for films and they chose the topics which were very close to the problems of people and the society. In the book Rethinking Third Cinema the

writer observed that:

" This was period when films began to be seen as playing a crucial role in pointing out the ills of society and culture specially partiality against women in particular, oppression of ruling classes with its realistic characters and their problems."(5)

Mohsin Makhmalbaf, Kia Rustami, Jafer Panahi, Tahmineh Milani, Samira Makhmalbaf are not a unfamiliar face in the world of cinema now. They are internationally acclaimed directors. The question is how Iranian cinema of today acclaimed by the western audience is developed in such a strict regime of the clergy? The complex and suppressing attitude that developed over the years between state and the people, between art and censorship, between culture and religiosity are the things which have to examine. Ayatollah Khomeini also criticized films and said that it is a source of corruption and pollution of mind and body. So after the revolution the initial step was taken by the regime was to ban the screening of films produced during the Pahlavi regime. After the revolution, the first step the Islamic regime took was to ban the screening of films produced during the Pahlavi regime. Cinema houses were burnt, the main cast and directors and producers were arrested by the Pasdarans or Revolutionary Guards of the Islamic Regime, and they were tortured and harassed by the intelligentsia. The script writers of the films were put behind the bars and tortured brutally. Their rejection of all Western values and the culture they promoted was one of the basic targets of the revolution. In the first few years after the establishment of the Islamic regime, the religious leaders took it upon themselves to abolish what to them were the western liberal values. The leader of the revolution Ayatollah Khomeinei had said:

"We are not opposed to cinema, to radio station or to television…The cinema is a modern invention that ought to be used for the sake of educating people, but as you know, it was used instead to corrupt our youth. It is the misuse of cinema that we are opposed to a misuse caused by the treacherous

policies of our rulers."(6)

This resulted to the main concern of the film makers had to be not overstepping the lines drawn by the censors. In 1983, the Ministry of Islamic culture and guidance formally rethought the rules and regulations which were to be followed to Islamic cinema, and an office of censorship was created. The most important of these guidelines were directly concerned with and their projection on screen. Hejab or Rusari made mandatory and there no physical contacts between men and women. There should be strict dress code for female characters. Besides this scenes with alcohol and cigarettes were also prohibited. In short, strict Shariah law was imposed and free interaction between men and women were prohibited on and off the screen. Even mother and son cannot touch each other. In the power of the veil- Shirin Nishat's Iran Tenaglia Susan pointed out that:

"Even the well known film makers of that era cannot dare to show these types of scenes in their films. The censor board and the clergies were getting stricter but by the late eighties, the hardliners realized that there was no future for an Islamic cinema and that the people of Iran wanted more from culture, art and film. The more secular among the ruling elite, with the help of radicals who had become more moderate themselves with the passing of time, encouraged an independent press and a free cinema."(7)

So the period from the late 1980s onwards may well be called the enlightened age of Iranian cinema. Films by Makhmalbaf, Abbas Kia Rustami, Samira Makhmalbaf, Jafer Panahi are unique in their treatment of subject matter. The result was the creation of a parallel cinema. Prerevolutionary directors like Rustami, Majid Majidi, Daiyush Meharjui, encouraged by changing scenario and experimented with new ideas, themes and subjects. With films by Mohsin, Bezai and Mehrjui, Iranian cinema did marvelous job and get noticed by international audience. War films like 'Bashu Gharib-e Kuchak' were made with sensivity and proved to be the pioneer of quality cinema.

After Khatami's election as president of the Islamic Republic of Iran, there was an upsurge in creative activity and a new phase began in Iranian cinema. This phase is very liberal and counterproductive in cinema making of Iran. A more determined and bolder stand was taken in cultural tolerance. Female characters were projected as leading cast by the young film makers and films that dealt with man-woman relationship were made like Tahmina Milani's Du Zan (Two Women), Bani Etemadi's Banu-i Ordibehist (Lady of May), Mohsin Makhmalbaf's Naubat e Ashqi (A Time of Love), and Majid Majidi's Ru sar-i Abi (The Blue Scarf). In 1996 Jafar Panahi's Badkonak -e Safed (The White Baloon) won the Camera d'Or at the Cannes Film Festival and the best foreign film award in the New Youth Film Critics Circle. Makkhmalbaf Gabbeh (The Carpet), brought out in 1997, won different awards and was screened in U.S.A. In 1998, Abbas Kia Rustamis' Taame Guilass (The Taste of Cherries), which one the Palme d, Or at Cannes, opened in New York and Los Angles to very good reviews.

When Iranian films were rejected by the film loving world in late 1980s and 1990s Kia Rustami's film gave respect and identity. His Deh (Ten), with its revolutionary nature gave the audience a new theme but termed as bold and audacious by more conservative viewers in Iran and abroad. The film explicitly analyses prevalent social-political drawbacks. Bani-Etemad (Nargess, 1992) places the blame of the evil habits of the main character in society by portraying them through urban public spaces - bazaars, streets, traffic, administrative offices or residential buildings. Directors avoid interior scenes, mainly to side step the limitations in the compulsory hejab and the ban on person-to-person physical contact. In Gabbeh Makhmalbaf has to use exchanged looks, and a distant shot of horse riders to allude to the lovers going off together. Often non-Iranian locations are used to depict forbidden emotions - adultery or love. For many exiled the film makers home is where the characters are not - Shahid-Sales Roses for Africa (1991) Utopia (1982) and Diary of a Lover (1977). In Manhattan by Numbers (Naderi 1993) the

main character searches among the homeless for his lost friend.

Social facts of this kind have a crucial bearing on many of the aesthetic traits of the new Iranian cinema. The widespread tendency in Iranian art films to shoot mainly or exclusively in exteriors can be traced in part to the censorship policies making it forbidden to show women in domestic interiors without their chadors, despite the fact that Iranian women almost invariably remove their chadors when they're at home. But this practice of shooting outdoors has interesting social consequences as well, so that one could discuss the use of cars in Kiarostami as emblems of the middle and upper classes being inflected socially as well as aesthetically in terms of whether their windows are open or closed. Closed windows create a sense of private space for the driver and open windows invite exchanges with pedestrians, much as movie going (as opposed to video watching) generally entails a private experience within a public space. All of which suggests part of what seems to connect cinema itself with social mobility in Iranian society.

Endnotes:

1. The New Iranian Cinema: Politics, Representation, and Identity by Richard Tapper, Iranian Studies, Vol. 38, No. 2 (Jun., 2005), p. 341

2. Susan Hayward, Cinema Studies; the Key concepts, Rutledge, IInd Edition, p.43

3. Oxford History of World Cinema, Oxford University Press, 1997, p.677

4. The Iranian Cinema, Godfrey Cheshire, http:www.indiaweek.com/durham/authors/Cheshire.html

5. Rethinking Third Cinema, Anthony R. Gunaratne and Dissanyke, Routledge,2003, chapter-8

6. Islam and Revolution, Ayatollah Khomeinei, Tr. Hamid Algar, Berkley; University Press, 1979, p.258

7. The power of the veil- Shirin Nishat's Iran, Tenaglia Susan The Nation, 1972.

Selected Bibliography:

1. The New Iranian Cinema: Politics, Representation, and Identity by Richard Tapper, Iranian Studies Vol. 38, No. 2 (Jun., 2005)

2. Susan Hayward, Cinema Studies; the Key concepts, Rutledge, IInd Edition

3. Oxford History of World Cinema, Oxford University Press, 1997

4. The Iranian Cinema, Godfrey Cheshire, http:www.indiaweek.com/durham/authors/Cheshire.html

5. Rethinking Third Cinema, Anthony R. Gunaratne and Dissanyke, Routledge,2003, chapter-8

6. Islam and Revolution, Ayatollah Khomeinei, Tr. Hamid Algar, Berkley; University Press, 1979

7. The power of the veil- Shirin Nishat's Iran, Tenaglia Susan The Nation, 1972.

8. Hamid Dabashi, 'Dead Certainities', The New Iranian Cinema, ed. Richard Tapper, London;I.B. Tauris

9. Hamid Dabashi, Masters and Masterpieces of Iranian Cinema, Mage Publication, New York

☆☆☆

Qaiser Ahmad (Dr.)

Asst. Professor, Dept. of Persian, MANUU, Hyderabad

QUTBSHAHI PERIOD: AN ERA OF INDO-IRANIAN LITERARY AND CULTURAL ACTIVITIES

The Qutbshahi Sultanate was among the prominent regions which contributed to the promotion of Persian language, literature and culture in Deccan. The founder of the Qutbshahi dynasty was Sultan Quli, an emigrant from Hamdan. He was made Governor of Tellingana in 1496 AD. He declared independence when the Bahmani Sultanate weakened. It was one of the five kingdoms emerged after the fall of Bahmani Sultanate.

Persian language and literature developed remarkably during this period. The Sultans of the dynasty were the patrons of the Persian art, language and culture. They themselves were educated and some of them were good poets and writers and even had few books to their credit.The language of the nobles was Persian. Most of the key posts were held by Iranians. Brahmins, who held high administrative posts, were encouraged to learn Persian.

RELATIONS WITH IRAN

The Iranian poets, writers, historians, religious leaders and intellectuals migrated to Deccan to be part of the Qutbshahi courts. The Qutbshahi Sultans welcomed them with the open heart. Like the Adilshahis, the Qutbshahis also established relations with Iranian Safavid kings. There was always a red carpet welcome whenever an Iranian envoy visited Golconda. High ranking officials used to receive the Iranian envoys. According to Professor Sharifunnisa Ansari, the Qutbshahi kings almost considered themselves as Iranians. They had cordial relations with Safavids

and they nurtured the culture that it used to be called as "Safahan-e-Naveen".

CULTURE

Muhammad Quli Qutbshah, the fifth ruler founded the new city of Hyderabad in 1591, which was named after Hazrat Ali's title "Haider". The city was planned by Iranians. Both the new cities of Golconda and Hyderabad became the centres of learning. People from Iran and other Central Asian countries flocked at the courts of Qutbshahi Sultans. With the arrival of many poets and writers from Iran Deccan became "Mini Iran". Its culture was the reflection of Iranian culture. The Iranians, who migrated in groups to Deccan,held important posts in the Sultanate and influenced every walks of livesby their culture during the Qutbshahi period.

The Qutbshahi Sultanate emerged as the centre of composite culture. The Muslims, Hindus and Christians, all were equal. The Hindus held high positions in the administration.The tradition of Muharram in the city was started during Qutbshahi period. Persian, Urdu, Arabic and Telugu were the main languages which were patronized. The Shahi firmans were issued in Persian and in Telugu also. Muhammad QuliQutbshah used to write verses in Telugu as well as in Deccani Urdu.

There was no dearth of poets and writers during the Qutbshahi period. According to Nasimuddin Hashmi, there was a place in Golconda named as "Aatish Khana", where poets and writers used to gather and discuss literary activities. According to Dr. T. N. Devare, the foundation of the composite culture of Deccan were led by Muhammad Tughlaq, who got his entire kingdom migrated from Delhi to Daulatabad. But Muhammad Quli Qutbshah was the king who promoted the composite culture of Hyderabad. Every Muslim and Hindu festivals were celebrated with zeal and zest. The festivals of Eid-ul-Fitr, Holi and Dessehra were of equal importance for the kings of the Qutbshahi sultanate.

LANGUAGE AND LITERATURE

There were innumerable poets and writers during this period. It is

impossible to even name all of them in this short article. I will just name a few. The founder of the dynasty Sultan Quli was an expert in calligraphy and had keen interest in mathematics. Yar Jamshid Qutbshah was a poet. His Qasida is preserved in Tarikh-e-Mohammad Qutbshahi. Sultan Ibrahim encouraged history writing.

The court poet of Muhammad Quli Qutbshah, Asadullah Wajhi, witnessed the period of four Qutbshahi Sultans. He wrote Masnavi Qutb Mushtari and wrote Sabras during the period of Abdullah Qutbshah. He was an emigrant from Khurasan.

Like his father, Mir Mohammad Momin Astrabadi was also a renowned scholar, who migrated from Iran during Muhammad Quli Qutbshah. He played important role in the administration also. He was appointed as the tutor of Prince Muhammad Sultan. He was the author of Resala Maqdariya in which the instruments of measurement and weighing are discussed. He also had a Diwan to his credit. The Qutbshahi envoy to Iran, Allama Sheikh Mohammad Ibne Khatoon was not only a famous administrator but was also a prolific writer, who authored five books. He used to write poetry and prose both. Mirza Reza Quli Beg was in the court of Shah Abbas Safavi but migrated to Hyderabad and got position in the court of Abdullah Qutbshah.

Mirza Amin Shahristani was another famous marsia poet of the court of Muhammad Quli Qutbshah. The diwan of Ruhul Amin, the title he was conferred upon, is known as Gulistan-e-Naz.The rich library of Muhammad Qutbshah had the books of religion, history, philosophy and culture. He used to study and write a lot.

Sultan Muhammad had keen interest in Philosophy, History and Theology. He edited the diwan of his uncle Muhammad Quli Qutbshah. He followed Hafiz in poetry. His diwan of 177 couplets can be found in Salarjang Museum and library. Tarikh-e-Qutbshahi was written during Sultan Mohammad's period.

The literary activities enhanced during the period of Abdullah

Qutbshah. Ghawasi was the court poet of the period. Abdullah Qutbshah encouraged many disciplines of education like, history, philosophy, mathematics, astrology etc. Shah Qazi translated Kasirul Miameen from Arabic into Persian. There are thousands of Persian works still lying in the different libraries of the city and have not been introduced yet.

HISTORY WRITING

History writing reached its zenith in Deccan during Qutbshahi period. Many history books were written in this period. The Chief justice of Sultan Quli Qutbshah's court, Mulla Hussain-e-Tabasi wrote Marghub-ul-Qutub, in which the reminiscences of the Sultan's early life are mentioned, as narrated by the Sultan himself.At the request of Ibrahim Qutbshah, Mulla Muhammad Sharif-e-Nishapuri wrote a comprehensive general history of the Muslim world. It is known as Majmaul Akhbar.

The history of Qutbshahi dynasty in verses was written by Munshi Hiralal Khushdil. The writer followed Bahman Nama of Azari. There is another history of the Qutbshahi dynasty in 18600 couplets by Hussain Ali al Farsi, which is known as Nasab Nama-e-Qutubshahi. A very important book named as Tarikh-e-Muhammad Qutubshahi was also written. It is the history of Qutbshahi dynasty till Muhammad Quli Qutbshah's regime. The writer of this book is unknown. The author tried to narrate the events with precision, avoiding exaggeration. Many historians considered it as the primary source. A selection of poetry of Muhammad Quli Qutbshah is also included in the book. There is an addition to Tarikh-e-Muhammad Qutubshahi called as Maasir-e-Qutubshahi. It is detail history of Muhammad Qutbshah's reign.

Hadiqatus Salatin by Mirza Nizamuddin Ahmad-as-Saidi-as-Shirazi. It is a history of Abdullah Qutbshah's regime. He was the witness to most of the events he has mentioned, as he was in his court. The account of the ceremonials and celebrations were beautifully expressed. The last chronicle of this period is Hadaiqus Salatin by Ali bin Taifur-e-Bistami. On the literary aspect it is important because it contains the poetry of Bahmani and Qutbshahi

kings.

ARCHITECTURE

Most of the monuments built during Qutbshahi Sultanante are the reflection of Iranian and Central Asian architecture. To build the forts, mosques and other monuments Iranian architects were employed. Here are some descriptions of the few monuments.

The inner forts of Golconda were first built by the founder king, Sultan Quli. Ibrahim Qutbshah built the outer forts. Sultan Quli Qutbul Mulk beautified Golconda fort and built mosques and palaces into it. The fort is 400 ft above the plains. There are three forts inside the Golconda, all protected by thick walls. It has eight heavy gates and fifty two windows. The doors were of teak wood and were studded with the spikes to protect from elephants' pressure. There were many cannons placed in the fort to counter the attacks of enemies. Most of the cannons have Persian inscription on them. Last additions to the fort were made by Abdullah Qutbshah.

Jama Masjid is opposite to the BalaHisar gate and was constructed by Sultan Quli, the founder of the dynasty in 1518. The mosque is without dome and minaret and posses Persian inscription on its entrance. Ashur Khana was also built to keeps alams or banners of Imam Hussain in the Persian tradition. The Amber Khana was the treasure house which was built by Abdullah Qutbshah in 1642 AD. One can find Persian inscription on it. More buildings were constructed alongside the walls of Golconda fort by Ibrahim Quli Qutbshah. Mosques and schools were built and many dams were constructed in the city.

The well planned city of Hyderabadwas founded by Muhammad Quli Qutbshah at thedistance of two kilometres from Golconda. The old bridge on Musi river connected the two cities of Golconda and Hyderabad. He was a great architect.

Sultan Muhammad Qutbshah laid the foundation of the Mecca Masjid in 1614 AD which was continued till last two Sultans. It was completed by the

Mughals after the victory of Aurangzeb.

Seven Tombs was the family graveyard of the Qutbshahi Sultanate. All the Sultans of the dynasty right from Sultan Quli Qutb to Abdullah Qutbshah were buried there. The last Sultan Abul Hasan is buried in Daulatabad as he was in exile. The tombs also include fountains, cascades, water channels and beautiful gardens.

The graceful monument of Charminar was built by Mohammad Quli Qutbshah in 1592 AD. According to the writer of Tuzk-e-Qutbshahi it was built as Taziya of Imam Hussain to get rid of plague. It has many floors. The first floor used to be the madarsa and hostel. There is a mosque on second floor. During the Qutbshahi period this was used for the gathering of Muharram Majlis.

Thus the Qutbshahi Sultanate played an important role in the promotion of Persian language, literature, art and culture.

BIBLIOGRAPHY

Persian Language and Literature in Golconda, Dr.Najma Siddiqua, Adam Publishers and Distributors, New Delhi, 2011.

A Short History of Persian Literature, Dr. T. N. Deware, Mackie Modi, Manager, Poona, 1961.

QutbshahiDaurka Farsi Adab, AkhtarHasan, AbulKalam Azad Research Institute Hyderabad, 1973.

Bahr-e-Tahqiq, Dr.ZaibHaider, Hindustan Art Printer, Hyderabad, 2001.

A Collection of Research Articles on Socio-Cultural History of Hyderabad, Dr.Tahseen Bilgrami, K. S. Latha Photo offset Printing Works, Hyderabad, 2008.

Hyderabad ki Mushtarka Tahzeeb, Iqbal Jahan Qadir, Mazharul Islam Press, Hyderabad, 1985.

☆☆☆

SABA SAMREEN ANSARI

Research Scholar, CAS. Department of History, AMU, Aligarh

The Role of Afghan Nobles during the Delhi Sultanate

Abstract

Afghan history in India constitutes a connecting link between the earlier ruler of the Turks, Saiyyad and the subsequent period of the Mughal authority. The Afghan occupies an especially significant position in the history of Muslim rule in India. The foundation of Delhi sultanate by the Muslim conquerors of Northern India attracted Afghan immigrants in a fairly large number because the sultan wanted them to help and stabilize their political supremacy over the territories conquered by them. This provided the Afghan immigrants from Muslim countries with fresh job opportunities. Afghans were poverty stricken and they had no traditions of urban culture. So they gradually rise to certain important ranks and position in the army and administration of Delhi sultanate and paved a new way for their cultural advancement in Indo-Muslim society.

Keywords: - Afghan, Nobles, Sultanate, Shiq, Iqta, Amir-i- Sadah.

Introduction

In this paper, an attempt has been made to highlight the role of Afghan nobles during the Delhi sultanate. This study intends to draw a frame work about the attitude and relation of Delhi Sultans with the Afghan nobles.

After reading the history of Farishta and others we realize that Afghans came from the Roh (a Pashtun word meaning mountain) in the Peshawar and other places of Punjab and Kashmir, which belonged to Raja Jayapal. But after the many struggle of some months, Jayapala who had also to face the rising Ghaznavid power, made peace with the Afghans by allowing

them to settle in some places of Langhana. The Afghan then erected a fort in the mountains of Peshawar which they called khaibar.

Position of Afghan nobles in Delhi Sultanate

Subuktagin realized the importance of the fighting material in the Afghan and enrolling them in his army he favored them in every possible way. They continued to be appointed as mercenaries in the army of sultan Mahmud Ghaznavi . They formed a significant wing in the army of sultan Mahmud Ghaznavi and sultan Muhammad Ghori. After the death of his patron and master, Qutubuddin also extended his patronage and raised them to the position of nobles. But in the reign of Iltutmish, Afghans were not raised to the position of the nobles either during his reign or his successors. But with the advent of Balban Afghan power again came into prominence. Balban could not ignore those Afghans who were rustic and awkward people. He gave him important ranks and positions in his sultanate. They were entrusted with the charge of military posts (thanas) around Delhi and in the parganas of Jalali, Kampli, Bhojpur and Patiali with the view to suppress the dacoits and highway robbers. Since this time the Afghan began to rise in status and dignity in the sultanate of Delhi . As a result the Afghan sawars and amirs were placed in sizeable numbers at strategic places in the empire. Many of the strong fort which built by Balban were garrisoned by the Afghans . But in the reign of Balban Afghans didn't participated in administration, they serve their activities only the life of soldiers. However, the advent of Khalji's to the throne of Delhi paved a successful way for their rapid promotion. By this time a new generation of the Afghan immigrants had come to the forefronts. To come in the contact of Indian environment, the number of this generation not only got accustomed to the political system of the sultanate but also acquired learning and a certain level of urban culture.

The principal of noble-birth of Delhi sultan was not taken into consideration, but the merit of a candidate was supposed to be the essential qualification for the state service. Thus person could rise in status and position

according to their abilities . Sultan AlauddinKhilji admitted them in his army in very large numbers and even enrolled those in his nobility. Malik Makh Afghan was an afghan, who enjoyed a prominent place in the administration till the time of Muhammad Bin Tughlaq . His brother Malik Afghan also rose to prominence during the khilji's period, which was sent by GhiyasuddinTughlaq to the expedition against Warangal in A.D.1321 under the leadership of his son prince Ulugh Khan.

Both Isami and Barani mention these two brothers along with the nobles of AlauddinKhilji in their section related to military expeditions that were led by the Delhi generals for the conquest of south India during the reign of sultan QutubuddinMubarakshahKhalji and sultan GhiyasuddinTughlaq Shah. This tends to imply that both of them were held in esteem for their post experience of the Deccan affairs. Under Muhammad Bin Tughlaq the most important nobles were Malik Khattab Afghan, Malik khan Afghan, Jalhu Afghan, Tughan al Afghan, Bahram Afghan and Malik Makh Afghan.

Malik Khattab Afghan was the governor of the fort of Rapri during the reign of Muhammad Bin Tughlaq, supported by a group of devoted followers (including 300 Afghans) he held the ground against a large number of powerful and recalcitrant zamindars who had combined and laid siege to fort Rapri . Later the sultan became doubtful of his loyalty in 1345 A.D., when Malik Makh Afghan rebelled, and throw him in the prison along with other afghan amirs. But shortly afterwards he was released and restored to his previous position.

Qazi Jalal another famous Afghan held the post of a Qazi, was posted with his afghan followers in Gujrat. He raises in rebellion but was defeated and killed by the imperial army. He rebelled along with Jhilu Afghan and some other non-afghan nobles, against sultan repressive measures.

Malik Makh Afghan a very well-known Afghan, who was one of the Amir-i-Sada (foreign amirs), who was posted in the vilayat of Daulatabad . He held the rank of 2,000 sawars. The Amir-i-Sadah was dissatisfied with the

administrative policy of the sultan, so they rebelled. Malik Makh Afghan spearheaded the great revolution of A.D.1345. His supporters raised the canopy over his head and proclaimed his sultan under the title of Nasiruddin. With no time he gathered 30,000 sawars and brought about the destruction of those who were unwilling to cooperate with him . When the sultan learned about such developments he marched with a large army to suppress his rebellion. Malik Makh and his supporters were defeated by the sultan and he had to flee to take shelter in the fort. But the rebellion of Malik Taghi in Gujrat compelled the sultan to return to Gujrat without fully suppressing the rebellion chieftains of Daulatabad. Therefore, the voluntarily abdicted in favour of Hasan Gangu and withdrew himself public life . The Afghan thus lost an opportunity to establish an independent kingdom in the Deccan.

The attitude of sultan Firoz Shah Tughlaq towards the Afghan nobles was also sympathetic. There were a large number of Afghans in imperial service during this period. Malik Bir afghan was the Muqta of the vilayat of Bihar, where he was succeeded by his son Daud Khan. Another afghan noble, Muhammad Shah Afghan, was entrusted with the fort for Tughlaqpur to keep a close watch over the turbulent zamindars of the vilayat of Etawah .About the same time Afghans continued to hold it during this period. Farishta informs that Malik MardanDaulat the Muqta of Multan had employed a large number of Afghans in army. Among these Afghans was Malik Bahman the ancestor of sultan Bahlol Lodi.

The Afghan continued to enjoy prominence under the Tughlaq sultans as well as Khalji sultans. In the reign of sultan Muhammad Bin Tughlaq a large number of Afghan live there. It deserves to be highlighted that the sultan didn't raise the Afghans alone to high rank but also promoted even those who belonged to the lower strata of the Hindu society . In actual fact they emerged as a new social formation in the indo-Muslim society at this time.

During the period of the successors of Firoz Shah Tughlaq also the Afghan nobles maintained their position in the sultanate of Delhi. Sarabli

Khan whom Sultan Firozshah had thrown in to prison, was reinstated by sultan Tughlaq Shah IInd (1388 A.D 1389 A.D) , when the Tughlaq regime began to decline the position of the Afghan in Etawah also become quite weak.

But the political ascendancy of the Afghans in Northen India began from the time of saiyyid rulers of Delhi. It was during their period that the Afghan become conscious of their power, for many of them, especially those belonging to the Lodi and Nuhani tribes, held important Shiqqs and Iqtas (territorial unit) in the sultanate of Delhi which was much reduced in area amongst that Malik Shah Bahman Lodi was assigned the territory of Sirhind by Khizr khan saiyyid in 1417 A.D . He had under him 12,000 Afghans and Mughal sawars. He was succeeded by him nephew, Bahlol as the muqta of Sirhind . Another noble Malik Sulaiman Lodi enjoyed high status in Multan where he lost his life while fighting against Sheikh Ali a Mughal of Kabul in A.D.1418. The extensive Iqta of Rapri was held by Hussain Khan Afghan who was succeeded by his son Kutub Khan Afghan, during the reign of Mubarak Shah Saiyyid. In A.D.1432 Malik Allahadad Lodi another Afghan was assigned Tarbindah, but soon he was driven away from there by JasarathKhokar .

Sultan Muhammad shah, the successor of sultan Mubarak shah, thereupon honored the loyal nobles with titles and officers. For his parts Allahadad Khan refused to accept any title and recommended his younger brother for the royal from the sultan conferred the title of Darya Khan upon his younger brother.

By the end of saiyyid rule through the Afghans of various clains had established their hold over a large number of places but because of their personal feuds and long standing jealousies and rivalries they could not take advantage of the fluid political conditions.

So in addition to Delhi sultanate the Afghans had established themselves in various provincial kingdoms. They had totally Indianized

themselves and had adopted Indian custom and manners in this way, the afghans slowly but steadily had assumed the position of a pressure group in the rapidly disintegrating sultanate of Delhi. He increased his power. The strength of his contingent, comprising Afghan, Mughal and also Indians soldiers caused by chaos and anarchy by Bahlol to aspired for sovereignty.

Conclusion

As a result we noticed that the factious spirit of the Amirs and the consequent confusion in the country offered Bahlol Lodi an opportunity to organize the Afghans power under his leadership and to make a bid to throne of Delhi. Upon accession to the throne of Delhi in A.D.1415. Bahlol Lodi adopted the policy of Afghanistan state administration. Thus Bahlol Lodi fulfills their dreams of establishing their rule in this country. After that he sent invitations tothe leaders of Afghans tribes in Roh to come to Hindustan and offered very liberal terms to them. As a result thousands of Afghans "like ants and locusts" arrived in Hindustan to seek their fame and fortune under the leadership of Bahlol.

Notes and References

1. M. A., Rahim,History of the Afghans in India A.D.1545- 1631, Karachi, Pakistan Publishing House, 1961, p. 29

2. Ibid, p. 29

3. Ziauddin, Barani, Tarikh- i- Firozshahi,(tr.) Elliot and Dowson, Delhi, Low Price Publications, 1867-77, pp.105; see also, I. H., Siddiqui, Some Aspects of Afghan Despotism in India,Aligarh, Three men publications, 1969, p. VI, Rita Joshi,The Afghan Nobility and the Mughals, New Delhi, Vikas Publishing House, 1985, p. 22

5. Tarikh- i- Firozshahi, Op. cit. p. 105

6. I.H. Siddiqui,"The Afghan and Their Emergence in India as Ruling Elite during the Delhi Sultanate" Central Asiatic Journal, vol., 26, no.3-4. 1982, p. 252

7. Some Aspects of Afghan Despotism in India, Op. cit., pp. vi-vii
8. Tarikh- i- Firozshahi, Op. cit., p. 258
9. Tarikh- i- Firozshahi, Op. cit., p.234
10. Some aspect of Afghan Despotism in India, Op. cit., p. xiv; The AfghanNobility under the Mughals, Op. cit., p. 23
11. Some aspect of Afghan Despotism in India, Op. cit., p. xiv
12. The AfghanNobility under the Mughals,Op. cit., 23
13. Tarikh- i- Firozshahi, Op. cit., p. 258
14. Mehdi, Hassan, Rise and fall of Muhammad Bin Tughlaq,London, 1938, p. 184; some aspect of Afghan Despotism in India, Op. cit., p. xv; The AfghanNobility under the Mughals, Op. cit., p. 24
15. M. K. Sherwani, "The Bahmanis ofthe Deccan" p. 36; Rise and fall ofMuhammad Bin Tughlaq",op. cit. p. 184
16. BahmadKhan, Tarikh- i- Muhammadi, (tr.) Mohd. Zaki, Bombay, Asia Publishing House, 1972, p.23
17. Tarikh- i- Muhammadi, Op. cit. p. 22
18.Some aspect of Afghan Despotism in India,op. cit. p. xv; Rita Joshi, op. cit., p. 25
19. "The Afghan and Their Emergence in India as Ruling Elite during the Delhi Sultanate" Central Asiatic Journal, vol. 26, no. 3-4. Op. cit., p. 253
20. M.K. Farishta,History of The rise of Muhammadan power in India", vol. I, (tr.) Jhon, Briggs, Delhi, Low Price Publications, 1829,p. 317.
Tarikh- i- Muhammadi, Op. cit., f. 418 b
21. "The Afghan and Their Emergence in India as Ruling Elite during the Delhi Sultanate", Central Asiatic Journal, vol., 26, no. 3-4. Op. cit. p. 257
22. Ibid., p 257-58
23. The AfghanNobility under the Mughals", Op. cit., p. 27

☆☆☆